(حصہ مختصر سوالات)

سوال نمبر۲: اقتباسات کی تشریح سیاق وسباق اور حوالے سے کریں۔

رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات

نوٹ: حوالہ تعارف مصنف اور تعارف سبق ہر سبق کے شروع میں تحریر ہے ہر اقتباس میں نہیں ہے۔ طالبعلم اقتباس کی تشریح لکھنے سے پہلے حوالہ، تعارف مصنف اور تعارف سبق شروع میں سے دیکھ کر ضرور لکھیں۔

حوالہ سبق:

درج ذیل کا اقتباس رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات سے لیا گیا ہے۔

حوالہ مصنف:

اس سبق کے مصنف سر سیّد احمد خان ہیں۔

اقتباس ۱ : انسان کی زندگی کا منشاء یہ ہے کہ اُس کے تمام قوی جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں اور ان میں باہم نامناسبت اور تناقص واقع نہ ہو بلکہ سب کامل کر ایک کامل اور نہایت متناسب مجموعہ ہو۔ مگر جس قوم میں پرانی رسم ورواج کی پابندی ہوتی ہے۔ یعنی ان رسموں پر نہ چلنے والا حقیر اور ملعون سمجھا جاتا ہے وہاں زندگی کا منشاء معدوم ہو جاتا ہے۔

تشریح:

پیش نظر عبارت میں سر سید احمد خان رسم ورواج کے ایک اور نقصان کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اپنی بات مضبوط کرتے ہیں کہ رسومات کی اندھیر نگری میں گڑھوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ انسانی فطرت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کامیاب وکامران اُس وقت ہوتا ہے اور زندگی کا مقصد صرف اس وقت حاصل کرتا ہے جب اُس کی شخصیت میں استحکام آجائے۔ استحکام سے مراد یہ ہے کہ زندگی کی تمام سرگرمیاں، تمام افعال، عبادات، اخلاقیات اور سماجیات ایک پختہ سوچ پر انحصار کریں اور اسی سوچ کو بنیاد بنا کر جانب منزل قدم بڑھائیں۔ ذہنی طور پر منتشر افراد کبھی بھی اپنی توانائیاں اور اپنا وقت صحیح طور پر استعمال نہیں کرتے اور جسم وروح کے اعضاء کی حق تلفی کرتے ہیں۔ ایک مکمل ومناسب اور پرسکون زندگی اور کردار کی تعمیر کیلیئے ضروری ہے کہ ہر موضوع فکر میں مناسبت اختیار کی جائے اور اعتدال کا خاص خیال رکھا جائے۔ مصنف کہتے ہیں کہ میانہ روی کی راہ پر چلنا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے غیر ضروری قوانین وروایات سے انحراف کریں اور اپنی توانائیاں صحیح مقاصد کیلیئے وقف کریں۔ ایسے معاشرے میں جہاں رسومات کو بلاضرورت اہمیت دی جاتی ہے وہاں ایک مستحکم کردار کی تعمیر ممکن نہیں۔

سب سے بڑی رکاوٹ جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ان اصولوں پر عمل نہ کیا جائے اور اپنی سہولیت سے مطابقت رکھتے ہوئے زندگی گزاری جائے تو ہر طرف سے مخالفت کی آواز بلند ہوتی ہے اور حقارت اور ذلالت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان معاشروں میں عزت ومعیار کا پیمانہ اس امر کو سمجھا جاتا ہے کہ کون کس حد تک ان رسومات کا پابند ہے۔ ایسے معاشرے میں زندگی کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور تمام افراد زمانے کی گہری دُھند میں ہمیشہ گُم ہو جاتے ہیں۔

اقتباس ۲: ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے کا نتیجہ ہے کہ آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہاں تک کہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچے ہر انسان کی خوشی اور اس کا حق ہے۔ پس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ جس پر کوئی چلتا ہے خاص اس کی خصلت پر مبنی نہیں ہیں بلکہ اگلی روایتوں پر یا پرانی رسم ورواج پر مبنی ہے تو وہاں انسانوں کو خوشحالی کا ایک بڑا جز موجود نہیں ہے اور جو کہ خوشحالی ہر فرد بشر کی اور نیز کل لوگوں کی ترقی کا بہت بڑا جزو ہے تو اس ملک میں جہاں رسموں کی پابندی ہے وہ جزو بھی ناپید ہوتا ہے۔

تشریح:

سر سید احمد خان دوسرے عقلمند کے قول سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آزادی اور مرضی سے کسی دوسرے فرد کو تکلیف نہ پہنچے اس طرح کی آزادروی خوشی ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ بلا وجہ رسم ورواج پر پابندی کرنے سے انسان اپنی عقل اور غور وفکر سے محروم ہو جاتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی نقصان کا باعث بننے لگتا ہے کیونکہ رسم و رواج پر بے سوچے سمجھے عمل کرنے سے فائدے کے بجائے نقصانات زیادہ ہوتے ہیں اس لئے عقل وفہم سے کام لینا انسان کے لئے ضروری ہے اور یہی درست طریقہ ہے کہ انسان غیر ضروری رسوم ورواجوں پر جانوروں کی طرح تقلید کرنے کی بجائے غور وفکر سے کام لے اور ایسے رسم ورواج کو اپنائے جن میں تعمیری پہلو موجود ہوں فائدے مند پہلو موجود ہوں اور ایسے رسم ورواج کو چھوڑ دینا چاہیئے جن میں برائیاں اور نقصان زدہ پہلو موجود ہوں کیونکہ ترقی اور خوشحالی کے لئے عقل وفہم سے کام لینا ضروری ہے۔

اقتباس ۳: ''جو امر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے فہم اور اپنی عقل سے کام لیں اور رسم ورواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں۔ یعنی کہ جو عمدہ ومفید ہوں اُن کو اختیار کریں جو قابل اصلاح ہوں ان میں ترمیم کریں اور جو بری اور خراب ہوں ان کی پابندی چھوڑ دیں۔

تشریح:

سر سید احمد خان اس عبارت میں اس وجہ کو بیان کر رہے ہیں جس پر عمل کر کے کوئی قوم ترقی کی جانب گامزن ہو جاتی ہے یا اگر کوئی قوم پستی سے نکلنا چاہتی ہو تو اسے اس فعل کو سرانجام دینا چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی بھی معاشرے کے لوگوں کو اپنے آباؤ اجداد کے بنائے ہوئے اصولوں کی کورانہ تقلید سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ انہیں اپنی عقل، اپنی سوچ، اپنے خیالات اور اپنے فہم سے کام لیتے ہوئے ان رسومات کو اچھی طرح پرکھنا چاہیئے اور ان کے فوائد ونقصانات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ ان رسومات و پابندیوں پر تحقیق کر لینے کے بعد ان کو یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ان ضوابط میں سے کون سے ان کے لئے مفید اور کن کی پیروی سے انہیں نقصان ہوگا۔ سر سید کہتے ہیں کہ بے جا اور فضول رسومات کو ترک کر کے ایسی تہذیب و تمدن ترتیب دینا بہتر ہے جس سے عہد حاضر کا معاشرہ مستفید ہو۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ اگر پرانی اور عائد کردہ رسومات میں کوئی خامی ہے تو اس کو دور کر کے اپنانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ لیکن آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو ان قوانین کی زنجیروں میں جکڑ لینا نہایت نقصان دہ ہے اور جہالت کے مترادف ہے۔ کسی بھی عقل و دانائی رکھنے والی قوم کو یہ عمل زیب نہیں دیتا کہ وہ رسومات کو مذہب کا درجہ دے اور بے جا کاموں میں اپنا وقت اور اپنی توانائیاں برباد کریں۔ رسم ورواج کو ایک مناسبت سے اختیار کرتے ہوئے اپنی زندگی گذارنی چاہیئے۔

اقتباس نمبر ۴: یہ بات خیال کی جاتی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ کرنے سے آدمی خراب کاموں اور بری باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے مگر یہ بات صحیح نہیں ہے اس لیے کہ انسان کی ذات میں جیسے کہ خراب کام کرنے کی قوتیں اور جذبے ہیں ویسے ہی ان کے روکنے کی بھی قوتیں اور جذبے ہیں مثلاً ایمان یا نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے۔ پس خراب کام ہونے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اس نے رسومات کی پابندی نہیں کی بلکہ یہ باعث ہے کہ اس نے ایک قسم کی قوتوں اور جذبوں کی شگفتہ اور شاداب اور قوی کیا ہے اور دوسری قسم کی قوتوں اور جذبوں کو پژمردہ اور ضعیف۔ اگر رسومات کی پابندی نہ رکھنے کے ساتھ انسان کا ایمان ضعیف نہ ہو یا وہ دلی نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے پژمردہ ہو تو بجز عمدہ اور پسندیدہ باتوں کے اور کسی بات کا ارتکاب نہ ہو۔

تشریح:

اس اقتباس میں سر سید احمد خان رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات پر مزید بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رسم ورواج پر عمل نہ کیا جائے یا افراد کو

رسم ورواج سے دور کرنے سے وہ خرابیوں اور برائیوں کو اپنانے لگیں گے۔ وہ بے ایمان ہو جائیں گے ایسا سمجھنا ٹھیک نہیں ہے اس لیئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو فطرف طور پر نیکی اور بدی پر چلنے اور ان سے روکنے کی دونوں قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی ہوئی ہیں۔ رسم ورواج اصلاحی، تعمیری اور نیکیوں پر مبنی ہونی چاہیئں تاکہ انسان کی نیکی اور ایمان کی فطری قوتیں پروان چڑھ سکیں۔ رسم ورواج پر عمل کرنے سے انسان مردہ دل اور قدامت پرست ہونے لگے تو ایسے رسم ورواج بیکار ہیں۔ اچھے رسم ورواج نیکی، اچھائی اور ایمان کی پختگی کا باعث بنتے ہیں ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

اقتباس ۵ : ان مشرقی یا ایشیائی قوموں میں بھی کسی زمانے میں قوت اہو عقل اور جودت طبع اور مادۂ ایجاد ضرور موجود ہوگا جس کی بدولت وہ باتیں ایجاد ہوئیں جواب رسمیں ہیں۔ اس لیئے کہ اُن کے بزرگ ماں کے پیٹ سے تربیت یافتہ اور محسنِ معاشرت کے فنون سے واقف پیدا نہیں ہوئے تھے۔

تشریح:

سر سید احمد خان تمام عاقل وفہیم افراد کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور ان کے سامنے یہ موضوع پیش کرتے ہیں کہ ہمیں ان باتوں کو عقل کے پیمانے پر پرکھنا چاہیئے جن کی وجہ سے اصول وضوابط ایجاد ہوئے اور زمانے کے ساتھ ساتھ ان میں ترمیم کرتے رہنا چاہیئے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ عہد حاضر میں جو رسم ورواج عائد ہیں وہ اس وجہ سے ترتیب پاتی ہیں کیونکہ معاشرے کے افراد میں گرد ونواح کے مطابق اپنے آپ کو ترتیب دینے کی صلاحیت موجود تھی اور انہوں نے ایسے قوائد وقوانین تشکیل دیئے جس سے ان کو بھرپور فائدہ حاصل ہو۔ انہوں نے اپنے فوائد اور معاشرے کے رہن سہن کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنی تخلیقی قوتوں سے اس طرح کام لیا کہ اپنے حق میں بہترین رسومات تشکیل دیں اور معاشرے کو اپنے اور اپنے فوائد کے طرز پر ڈھالا۔ سر سید کہتے ہیں کہ اس دور میں معاشرے کے افراد میں جو صلاحیتیں تھیں ان کو معاشرے کے لحاظ سے نکھار کر ہی روایات قائم ہوئیں۔ انہوں نے اپنی عقل وفہم سے کام لیا، تب ہی وہ اس قابل ہوئے کہ کچھ تخلیق کریں۔ وہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں تھے جو تمام علم لے کر اس دنیا میں اتری ہو اور نہ ان پر کوئی وحی نازل ہوتی تھی جس کو دیکھ کر انہوں نے اصول بنائے۔ مصنف کہتا ہے کہ ہم بھی ویسے ہی افراد ہیں ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی عقل اور ذہنی قوتوں کو استعمال کریں اور اپنے دینوی واخروی فائدوں کے لحاظ سے آئینِ جہانبانی تشکیل دیں۔

اقتباس نمبر ۶: رسومات جو مقرر ہوئی ہیں غالباً اس زمانہ میں جبکہ وہ مقرر ہوئیں مفید تصور کی گئی ہوں مگر اس بات پر بھروسہ کرنا درحقیقت وہ ایسی ہی تھیں محض غلطی ہے۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں نے ان کو مقرر کیا ان کی رائے میں غلطی ہو اور ان کا تجربہ صحیح نہ ہو۔ ان کا تجربہ نہایت محدود اور صرف چند اشخاص سے متعلق ہو یا اس تجربہ کا حال صحیح بیان نہ ہوا ہو یا رسم ورواج اس وقت اور اس زمانہ میں مفید ہو لاً حال کے زمانہ میں مفید نہ ہو بلکہ مضر ہو یا وہ رسم جن حالات پر قائم کی گئی تھی کسی شخص کی وہ حالت نہ ہو۔ غرض کہ رسموں کی پابندی میں مبتلا رہنا ہر طرح پر نقصان کا باعث ہے اگر کوئی اور نقصان نہ ہو تو یہ نقصان تو ضرور ہے کہ آدمی کی عقل اور دانش اور جودت طبع اور قوت ایجاد باعمل ہو جاتی ہے۔

تشریح:

سر سید احمد خان اپنے اس اصلاحی سبق میں رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات سے آگاہ کر رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ رسم ورواج پرانے زمانے سے چلے آتے ہیں۔ اکثر یہ صدیوں سال پرانے ہوتے ہیں اس پرانے زمانے کے لوگوں نے ان رسوم اور رواجوں کو اپنے لیئے فائدہ مند سمجھا ہوگا۔ ہوسکتا ہے قدیم زمانے میں ان کی فائدہ مند حیثیت رہی ہو مگر موجودہ دور میں اس چیز پر بھروسہ کرنا حماقت سے کم نہیں۔ ممکن ہے قدیم دور کے لوگوں کا یہ عمل صحیح نہ ہو اور وہ اسے صحیح سمجھ رہے ہوں۔ قدیم دور میں معاشرت کا دارومدار چند مخصوص افراد کی مرضی پر بھی ہوتا تھا اس لیئے ان گنتی کے افراد کا تجربہ ناقص اور نامکمل ہو۔ اگر قدیم زمانے میں رسم ورواج اچھے اور فائدہ مند رہے بھی ہوں مگر موجودہ دور میں یہ مضر اور نقصان دہ رسم ورواجوں پر عمل کرنے سے انسان کی عقل وفہم پر زنگ لگ جاتا ہے اور تخلیقی رجحانات ختم ہونے لگتے ہیں۔

اقتباس ۷ : تواریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی قدر عرصے تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے اور اس کے بعد ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔ مگر یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے۔ یہ اس وقت مسدود ہوتی ہے جب کہ اس قوم میں سے وہ قوت اٹھ جاتی ہے جس کے سبب سے نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔

تشریح:

تشریح طلب عبارت میں مصنف منطق اور استدلال سے کام لیتے ہوئے اُمّتِ مُسلمہ کی وجہ زوال کو بیان کر رہے ہیں۔ مصنف دنیا کی تواریخ کو ایک مضبوط دلیل کے طور پر استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ گزرے ہوئے ادوار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جس قوم نے بھی ترقی کی وہ اس عرصے تک قائم رہتی ہے جب تک اس نے ایک متمدن اور مہذب معاشرہ قائم رکھا ہے۔ اس دور کے بعد اقوام آہستہ آہستہ پستی کے گڑھے میں گر جاتی ہیں اور ان کی عوام سے نظم اور حکومت سے استحکام عار ہو جاتا ہے۔ مصنف تمام فہم و فراست اور عقل و دانش رکھنے والے اذہان کو مخاطب کرتے ہیں اور ان کی سوچ اس جانب گامزن کرتے ہیں کہ کس وجہ سے یہ ترقی رکی؟ کیسے یہ رکاوٹیں کھڑی ہوئیں؟ اور کیوں کر اس قوم کا طریقہ کار ہوا؟ وہ اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں اپنا نظریہ پیش کرتے ہیں کہ قوموں کی تنزلی کی ابتدا اس وقت شروع ہوتی ہے جب اس قوم کے افراد رسم و رواج کی اندھی تقلید شروع کر دیتے ہیں اور بلا سوچے سمجھے ان اصول و ضوابط کو اپنی زندگیوں میں شامل کر لیتے ہیں۔ اخلاقی اقدار میں ان قوانین کی شمولیت معاشرے پر بہت گہرے اثرات مرتب کرتی ہے اور ذہین سے ذہین سوچیں ان رسومات کی نظر ہو جاتی ہیں۔ آخر کار ان انسانوں میں سے وہ مادہ اٹھ جاتا ہے جس کی بدولت تفکر ان کے دائرے وسیع ہوتے ہیں، فکر کی موجیں ابھرتی ہیں اور شعور کی کرنیں پھیلتی ہیں اور یہ معاشرہ تیز رفتار دنیا کے ہمقدم ہونے کے بجائے رسم و رواج کے منجدھار میں ہمیشہ کے لیئے پھنس جاتا ہے۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ عہد حاضر میں ملت اسلامیہ کا بالکل یہی حال ہے اور ان کی شاہانہ حکومت کے زوال کی وجہ رسومات کی کورانہ پیروی ہے۔

اقتباس ۸: بے سوچے اور سمجھے رسومات کی پابندی کرنے سے گو وہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں، آدمی کو ان صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی جو خدا تعالی کو جدا جدا عنایت کی ہیں۔ ان قوتوں کا برتاؤ جو کسی چیز کی بھلائی برائی دریافت کرنے اور کسی بات پر رائے دینے اور باتوں میں امتیاز کرنے اور عقل و فہم کو تیز رکھنے بلکہ اخلاقی باتوں کو بھلائی برائی تجویز کرنے میں مستعمل ہوتی ہیں صرف ایسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ہم کو ہر بات پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہوے جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہو وہ شخص اس کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا اور ایسے شخص کو اس بات کی تمیز یا خواہش میں کچھ تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جبکہ وہ استعمال میں لائی جائیں۔ ان قوتوں کو اوروں کی تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایسے شخص کے لئے بجز ایسی قوت تقلید ہوتی ہے اور کسی قوت کی حاجت نہیں۔

تشریح:

سر سید احمد خان اس اقتباس میں رسم و رواج پر سختی سے مخالفت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے خیال میں بغیر غور و فکر کئے رسم و رواجوں پر عمل کرنے سے انسان کی ترقی اور خوشحالی ممکن نہیں ہوتی۔ خواہ وہ رسم و رواج اچھے ہی کیوں نہ ہوں۔ خدائے بزرگ و برتر نے ہر انسان کو الگ الگ صلاحیتیں عطا کیں ہیں۔ ان صلاحیتوں او و طاقتوں کی نشو و نما عقل و فہم کو استعمال کرنے سے ہوتی ہے غور و فکر کرنے سے ہوتی ہے انسان کی عقل و فہم اور تمام توانائیاں اچھائیاں اور نیکی کے فروغ کے لئے استعمال ہونی چاہئیں۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب انسان کو مکمل اختیار دیا جائے۔ رسم و رواج پر عمل کرنے یا نہ کرنے کی اسے عقلی آزادی ہو۔ اسے زبردستی رسم و رواج پر تقلید پر مجبور نہ کیا جائے اسے ایسا انسانی بندر نہ بنایا جائے جو نقالی اپنا کر زندگی گزارتا ہے اسے عقل و فہم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

روزمرہ اور محاورہ

حوالہ سبق: یہ اقتباس سبق "روزمرہ اور محاورہ" سے لیا گیا ہے۔

حوالہ مصنف: یہ سبق مولانا الطاف حسین حالی نے تحریر کیا ہے۔

اقتباس نمبر ۱: "روزمرہ" اور "محاورہ" میں من حیث الاستعمال ایک اور بھی فرق ہے۔ روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو، تقریر اور نظم و نثر میں ضروری سمجھی گئی ہے، یہاں تک کہ کلام میں جس قدر روزمرہ کی پابندی کم ہوگی، اسی قدر وہ فصاحت کے درجے سے ساقط سمجھا جائے گا۔

تشریح:

مولانا الطاف حسین حالی اس اقتباس میں ''روزمرہ اور محاورہ'' اردو زبان میں استعمال کی حیثیت سے ایک اور فرق کو واضح کرتے ہیں۔ روزمرہ الفاظوں اور جملوں کی پابندی تحریر اور تقریر اور نظم و نثر میں لازمی سمجھی جاتی ہے۔ زبان کی اصل اہمیت روزمرہ کی بول چال ہے نہ کہ محاورہ۔ اگر کوئی تحریر لوگوں کے روزمرہ کے جملوں کے مطابق ہو تو وہی پسندیدہ اور مشہور سمجھی جائے گی۔

اقتباس نمبر ۲: محاورے کو شعر میں ایسا سمجھنا چاہیے، جیسے کوئی خوب صورت عضو بدن انسان میں۔ اور روزمرہ کو ایسا جاننا چاہیئے، جیسے تناسب اعضا بدن انسان میں۔ جس طرح بغیر تناسب اعضا کے کسی خاص عضو کی خوبصورتی سے حسن بشری کامل نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی طرح بغیر روزمرہ کی پابندی کے محض محاورات کے جا و بے جا رکھ دینے سے شعر میں کچھ خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔

تشریح:

مولانا الطاف حسین حالی اس اقتباس میں محاورے کی اہمیت کو اس طرح سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ محاورہ ایک انسان کے دلکش اور خوبصورت عضو یا حصے کی مانند ہے اور ''روزمرہ'' بول چال کی مثال انسان کے تمام عضو یا حصوں سے ہے جن کی وجہ سے انسان کا جسمانی تناسب برقرار رہتا ہے۔ اگر جسم کا ایک حصہ یا عضو چاہے کتنا ہی دلکش و خوبصورت کیوں نہ ہو اگر اس کا باقی جسم اور حصے بے ڈھنگے اور غیر متناسب ہوں گے تو اسے دلکش اور خوبصورت نہیں سمجھا جائے گا۔ دلکشی اور خوبصورتی کے لیے جسمانی اعضاء کا ایک دوسرے سے توازن و تناسب بہت ضروری ہے۔ اس طرح شعر میں روزمرہ زبان کے استعمال اور مناسب محاورے کے موزوں استعمال بھی ضروری ہے۔ تب ہی شعر میں خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔ بے جا محاوروں کے استعمال سے شعر کا حسن خراب ہو سکتا ہے۔

اقتباس نمبر ۳: کیونکہ فن شعر میں اور خاص کر اردو زبان میں کوئی بات اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ عمدہ مضمون معمولی بول چال اور روزمرہ میں پورا پورا ادا ہو جائے۔ جن لوگوں نے روزمرہ کی پابندی کو سب چیزوں سے مقدم سمجھا ہے، ان کے کلام کو بھی، جب نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو جا بجا فروگزاشتیں اور کسریں نظر آتی ہیں۔ پس جب کوئی شعر باوجود مضمون کی متانت اور سنجیدگی کے روزمرہ اور محاورے میں بھی پورا اتر جائے تو لامحالہ اس سے ہر صاحب ذوق کو تعجب ہوتا ہے۔

تشریح:

اس اقتباس میں مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں کہ شعر کہنے کے فن میں خاص طور سے اردو زبان میں اس سے زیادہ مشکل چیز نہیں ہے کہ اچھے اور عمدہ موضوع کو معمولی بول چال کی زبان ''روزمرہ'' میں استعمال کیا جائے۔ جن لوگوں نے روزمرہ بول چال کی پابندیوں کو سب سے زیادہ ضروری خیال کیا ان کی کاوشوں کو جب بھی تنقیدی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو جا بجا خامیاں، غلطیاں اور بھول چوک نظر آتی ہیں اس کے باوجود کوئی شعر موضوع کی مناسبت سے سنجیدگی اور شائستگی لیئے ہوئے ہو یعنی اس میں روزمرہ کے الفاظ اور موزوں محاورے استعمال کیئے گئے ہوں تو پڑھنے والے اور اچھے ادب کے ذوق رکھنے والے لوگوں کو حیرت اور تعجب ہوتا ہے۔

اقتباس نمبر ۴: الغرض روزمرہ کی پابندی تمام اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً جہاں تک ہو سکے نہایت ضروری چیز ہے اور محاورہ بھی بہ شرطے کہ سلیقے سے باندھا جائے، شعر کا زیور ہے۔

تشریح:

مولانا الطاف حسین حالی اس اقتباس میں کہتے ہیں کہ روزمرہ کے استعمال کے الفاظوں کی پابندی شعر کی تمام قسموں یعنی غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ میں سختی سے کی جانی چاہیئے۔ خاص طور سے غزل جیسی صنف میں ان کا استعمال ضروری ہے اور محاوروں کو بھی ضرورت کے مطابق وقت، سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ اشعار میں استعمال کرنا چاہیئے کیونکہ ان ہی چیزوں سے شاعری سجتی ہے یعنی روزمرہ اور محاورے اشعار کے زیورات ہیں۔

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

حوالہ سبق: یہ اقتباس سبق "سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ" سے لیا گیا ہے۔

حوالہ مصنف: اس سبق کو مولانا محمد حسین آزاد نے تحریر کیا ہے۔

اقتباس ۱: واضح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی جو کہ ملکہ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا تو اول تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر دیا تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی عزت دوام کا تاج مرصع سر پر رکھا گیا حکم ہوا کہ جاؤ اولادِ آدم میں نور پھیلاؤ۔

تشریح:

مولانا محمد حسین آزاد کا یہ سبق تمثیلی انداز لیئے ہوئے ہے جس میں انسانی صفات و خصوصیات کو زندہ انسانوں کے روپ میں پیش کیا گیا ہے سچائی اور برائی کی جنگ اور کشمکش کو اجاگر کیا گیا ہے۔ سچائی کی ملکہ کی جب تعلیم و تربیت مکمل ہوگئی تو وہ اپنے والد سلطان آسمانی کے دربار میں حاضر ہوئی۔ اس کی ماں جو ملکہ دانش کے نام سے مشہور تھی اور نیکی، سچائی اور اس جیسی دوسری خوبیوں کو حاصل کر چکی تھی، دربار کے تمام امراء نے سچائی کی ملکہ کی بڑی تعریفیں کیں۔ باپ کی جانب سے بیٹی کے سر پر ہمیشہ قائم رہنے والا عزت و افتخار کا تاج رکھا گیا اور حکم دیا انسانوں کی دنیا میں جا کر نیکی اور سچائی کی اشاعت کرو اور اپنی روشنی سے پوری کائنات کو منور کر دو۔

اقتباس ۲: سچ کے زور و طاقت کو کون نہیں جانتا۔ چنانچہ ملکہ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے، اٹھی اور اپنے زور میں بھری ہوئی اٹھی، اسی واسطے بلند ہو کر اکیلی آئی اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی، ہاں آگے آگے فتح و نور کا غبار اڑاتے آتے تھے اور پیچھے پیچھے ادراک پر پرواز تھا مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ تھی مگر استقبال رکاب پکڑے تھا اور جو قدم اٹھتا تھا، دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیا فرشتے سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔

تشریح:

مولانا محمد حسین آزاد اس سبق میں تمثیلی انداز اپنائے ہوئے ہیں سچائی اور برائی کی کشمکش بیان کر رہے ہیں کہ سچائی کی قوت کو کون نہیں جانتا۔ اس لیئے سچائی کی ملکہ کو بھی حقیقت پسندی کا دعویٰ تھا۔ وہ اپنی قوت سے اٹھی۔ بغیر کسی مدد کے وہ اکیلی ہی آگئی۔ اس کے آگے کامیابیوں اور فتوحات اس طرح چل رہی تھیں جیسے وہ روشنی کے غبار ہوں۔ ملکہ کے پیچھے عقل و بصیرت رواں دواں تھی۔ جو ملکہ کے ساتھ نہیں بلکہ ماتحتی میں چل رہی تھی۔ ملکہ کی شان بادشاہوں جیسی تھی اور رعب و دبدبہ بھی شاہوں جیسا تھا۔ ملکہ آہستہ آہستہ آئی تھی اس کی سواری کی رکابیں عزم و استقلال تھامے ہوئے تھا۔ یعنی، ملکہ میں صبر، عزم و استقلال اتنا زیادہ تھا کہ اس کا قدم رک جاتا تو انسان تو کیا اس کے عزم و استقلال کو فرشتے بھی نہیں ہٹا سکتے تھے۔

اقتباس ۳: عالم سفلی میں دروغ دیو زاد ایک سفلہ نابکار تھا کہ حمق تیز دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی، اگرچہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی، مگر جب کبھی کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے تو ان کی سنگت میں وہ آ جاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن بھی وہ آیا ہوا تھا اور بادشاہوں کو ایسا خوش کیا ہوا تھا کہ اسے ملبوسِ خاص کا خلعت مل گیا۔ یہ منافق دل میں سلطانی آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چاپ نکلا اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کے ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔

ربطِ ماقبل:

دی گئی سطور سے قبل مضمون میں صداقت زمانی کے خاندان کا تعارف اسکی تعلیم و تربیت، اوصاف حمیدہ اور اس کے بعد سلطانِ آسمانی کی ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس

میں اس کے باپ نے اس کے سر پر ہمیشہ رہنے والا عزت و وقار کا تاج سجا کر اسے دنیا میں حق و صداقت اور نیکی اور بھلائی پھیلانے کے لیئے بھیجا تا کہ اولادِ آدم شیطانی قوتوں کے فریب سے محفوظ رہ سکے۔

تشریح:

پیش نظر سطور میں مولانا لکھتے ہیں کہ دنیا میں صداقت زمانی جیسی عظیم قوت جو نیکی اور سچائی کی ضمانت ہے اس کے مدِ مقابل دوسری دیوہیکل شیطانی قوت دروغ یا جھوٹ تھا جس کا باپ تاریک الدماغ منفی سوچ کا حامل، بے ہودہ اور قابلِ نفرت اوصاف کا حامل احمق تھا اور ماں نفسانی خواہشات کی پجاری ہوس تھی۔

ایسے تو اس شیطان صفت دروغ کو ناپسندیدہ اور نامعقول سمجھتے ہوئے سلطانی آسمانی نے اپنی مجلس میں آنے کی اجازت نہ دی مگر پھر بھی وہ موقع ملتے ہی تفریح یا ہنسی مذاق کی محفلوں میں یا جشن کی محفلوں میں مراثیوں کے حلیئے میں چھپ کر آجاتا جو سوانگ بھر کر اور روپ بدل کر اہلِ مجلس کے دلوں کو لبھانے اور جھوٹی مسرتوں سے ان کے قلوب کو بہلانے کی خاطر آیا کرتے تھے۔ ان کے توسط سے دربار میں پہنچ کر وہ اپنی کرشمہ سازیوں اور فتنہ سازیوں کے جادو جگایا کرتا تھا۔

یہ شیطانی فرزند دروغ، سلطانی آسمانی اور اس کی لاڈلی بیٹی صداقت زمانی سے حد درجہ نفرت اور دل میں نفاق رکھتا تھا۔ جب اس نے دربار میں صداقت زمانی کا یہ وقار دیکھا اور اس کے باپ سلطان آسمانی کا اسکو دنیا میں بھیجنے کا سندیسہ سنا تو پیچ و تاب کھاتا ہوا اور بارسے کھسک کر اسکے خلاف برسرِ پیکار ہونے کی خاطر دنیا میں پہنچا تا کہ انسانوں کے دلوں پر اپنی حکمرانی قائم کر سکے۔

اقتباس ۴ : جب یہ دو دعویدار نئے ملک اور نئی رعیت کے تسخیر کرنے کو اٹھے تو چونکہ بزرگان آسمانی کو ان کی دشمنی کی بنیاد ابتداء سے معلوم تھی سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں کہ دیکھیں ان کی لڑائی کا انجام کیا ہو؟

ربطِ ماقبل:

پیش نظر سطور سے قبل مولانا آزاد نے صداقت زمانی اور دروغ جو ایک دوسرے سے متضاد خوبیوں کے حامل تھے، کے خاندان کا تعارف اور مثبت اور منفی خوبیوں کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ دروغ صداقت زمانی کے ساتھ اس کی حکمرانی میں خلل ڈالنے اور اس کے بھلائی نیکی کے مشن کو ناکام بنانے کے لیئے دنیا میں آموجود ہوا۔

تشریح :

پیش نظر سطور میں آزاد کہتے ہیں کہ جیسے ہی سچ اور جھوٹ کی قوتوں نے دنیا میں اپنا ڈیرہ جمایا اور ایک دوسرے کے صف آراء ہو گئے تو ان میں سے ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ انسانوں پر اپنی بالادستی قائم کرے اور دوسرے کے اثرات کو مرتب نہ ہونے دے۔ چنانچہ دونوں اپنے اپنے مشن کی کامیابی کے لیئے پوری توانائیوں کے ساتھ متحرک ہو گئے۔ جھوٹ کی پوری کوشش ہوتی کہ اولادِ آدم اس کے جال میں گرفتار ہو کر بدی کی عاشق ہو جائے اور نیکی ترک کردے۔ جب کہ سچائی کی بھرپور کوشش تھی کہ انسان دروغ کے جال میں پھنس کر راہِ حق اور بھلائی کے راستے سے نہ بھٹکیں۔ وہ انسانوں کو دروغ کے فریب اور شیطانی صفات سے آگاہ کرتی رہتی غرض یہ کہ دونوں اسی تگ و دو میں مصروف رہتے اور مقابلہ جاری رہتا۔

آسمانی مخلوق فرشتے دنیا پر نگاہیں جمائے ان دونوں کی معرکہ آرائی دیکھتے رہتے اور اس کے نتائج جاننے کے لیئے مسلسل اسی طرف متوجہ رہتے تا کہ انھیں معلوم ہو کہ کون دروغ کا پرستار، جھوٹ کا دلدادہ ہے اور کون سچ کا مطیع، نیکی کا امین اور حق و صداقت کا طرفدار ہے غرض وہ اس معرکہ آرائی میں فاتح اور شکست خوردہ کردار سے آگاہ ہونا چاہتے تھے۔

اقتباس ۵ : ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک بجلی کی تلوار نہ تھی مگر تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا اور رعب خداداد کا خود سر پر دھرا تھا جب معرکہ مار کر ملکہ فتح یاب ہوتی تھی تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک، بے حیائی کی ڈھال منہ پر لے، ہوا و ہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشان لشکر گر پڑتا تھا اور پھریرا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔

تشریح:

مولانا محمد حسین آزاد جھوٹ اور سچ کی اس جنگ میں مزید کہتے ہیں کہ ملکہ کے ہاتھوں میں باپ کی کڑک جیسی تلوار نہیں تھی مگر اس کا چہرہ ہیبت ناک تھا۔ اس بے پناہ

صلاحیت رکھنے والی ملکہ کا رعب و دبدبہ نظر آتا تھا۔ جنگ میں فتح و نصرت اسی کے صلے میں آتی تو جھوٹا دیوزاد اپنے تیروں کا ترکش پھینک کر بے حیائی کی ڈھال سے اپنے منہ کو چھپا کر اس لالچ و ہوس کی دنیا میں کہیں چھپ جاتا تھا، اس کے لشکر کا نشان گر پڑتا اور لوگ اس کے جھنڈے کو زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔

اقتباس ۶ : دروغ دیوزاد بہروپ بدلنے میں تاک تھا ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سوانگ بھرتا تھا تو بھی وضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دنیا کی ہوا و ہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کا ساتھ لیئے تھیں اور کیونکہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا، اسی لیئے لالچ کا مارا کمزور تابعداروں کی طرح ان کے حکم اٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں اس طرح کی بے معنی تھیں اور کام بھی الٹ پلٹ بے اوسان تھے کیونکہ استقلال ادھر نہ تھا۔ اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتحیاب تو جلد ہو جاتا مگر تھم نہ سکتا تھا، ہوا و ہوس اس کے یار و یاد ار تھے اور اگر کچھ تھے تو وہ ہی سنبھالے رہتے تھے۔

ربطِ ماقبل :

پیش نظر سطور سے قبل مولانا آزاد نے صداقت زمانی اور دروغ جو ایک دوسرے سے متضاد خوبیوں کے حامل تھے، کے خاندان کا تعارف اور ان کی مثبت اور منفی خوبیوں کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ دروغ، صداقت زمانی کے ساتھ اس کی حکمرانی میں خلل ڈالنے اور اس کے بھلائی نیکی کے مشن کو ناکام بنانے کے لیئے دنیا میں آموجود ہوا اور بتایا گیا ہے کہ جب دونوں قوتیں دنیا میں برسرپیکار ہوگئیں تو آسمانی مخلوق یعنی فرشتے بھی اس معرکہ کا مشاہدہ کرتے اور نتیجے کا بے چینی سے انتظار کرتے کہ کون فاتح اور کون مفتوح ٹھہرے گا۔

غرض کہ ملکہ صداقت شاہانہ وقار اور دبدبے سے کامیابی کے یقین کے ساتھ دنیا میں آموجود ہوئی۔ ہر جگہ اس کا والہانہ استقبال ہوا یعنی لوگوں نے سچائی کو اختیار کیا اور اس پر ڈٹے رہے۔

تشریح :

پیش نظر اقتباس میں آزاد سچ اور جھوٹ کے باہمی مقابلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قوی، دیوہیکل اور شیطانی صفات کا حامل دروغ ایک بہروپیا تھا۔ وہ روپ بدل بدل کروار کرنے میں مہارت رکھتا تھا۔ کبھی وہ سچ کا فرضی روپ دھار کر انسانوں کو بہکاتا کہ وہی اصل نیکی ہے لیکن جب وہ اپنے اس فریب کا جال بچھاتا تو "جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے" کے مصداق ہر لمحے اس پر بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ طاری رہتی۔ دوسروں کو فریب دینے میں بے شمار قوتیں اسکی مددگار اور معاون ہوتیں۔ اس موقع پر وہ ہوس، لالچ، بے حیائی، بے غیرتی، دغا اور طراری جیسی قوتوں کو حملہ آور ہونیکا حکم دیتا۔ یہ قوتیں انسانوں کے دلوں میں دروغ کی اہمیت اور صداقت کی کمتری کا احساس کر کے باور کرواتی ہیں کہ فتح و بلندی جھوٹ کے سر ہے جو جتنا جھوٹ بول سکتا ہے وہ اتنا ہی کامیاب ہے۔ دغا و فریب جو دروغ کے چہیتے تھے انسانوں کو دروغ کے جال میں پھنسانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اقتباس ۷ : کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی آپڑتی تھی۔ اس وقت دروغ دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لیئے سر پر بادل دھواں دار پگڑ لپیٹ لیتا تھا۔ لاف و گزاف کو حکم دیتا کہ شیخی و نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کر دو۔ ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دیتا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ، داہنے ہاتھ میں طراری کی تلوار، بائیں ہاتھ میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی، غلط نما تیروں کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا و ہوس داہنے بائیں دوڑتے پھرتے تھے، دل کی ہٹ دھرمی، بات کی پچ پیچھے سے زور لگاتے تھے۔ غرض کبھی مقابلہ کرتا تھا تو ان زوروں کے بھروسے کرتا تھا اور باوجود اس کے ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دور دور سے لڑائی ہو۔ میدان میں آتے ہی تیروں کی بوچھار کر دیتا تھا مگر وہ بھی، باد ہوائی، انکل پچو، بے ٹھکانے ہوتے تھے۔ خود ایک جگہ پر نہ ٹھہرتا تھا، دم بہ دم جگہ بدلتا تھا کیونکہ حق کی کمان سے جب تیر نظر اس کی طرف سر ہوتا تھا تو جھٹ تاڑ جاتا تھا۔

ربطِ ماقبل :

پیش نظر سطور سے قبل مولانا آزاد نے صداقت زمانی اور دروغ جو ایک دوسرے سے متضاد خوبیوں کے حامل تھے ان کے خاندان کا تعارف ان کی مثبت اور منفی خوبیوں کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ دروغ صداقت زمانی کے ساتھ اس کی حکمرانی میں خلل ڈالنے اور اس کی بھلائی، نیکی کے مشن کو ناکام بنانے کے لیئے دنیا میں آموجود ہوا اور

بتایا گیا ہے کہ جب دونوں قوتیں دنیا میں برسرِ پیکار ہوگئیں تو آسمانی مخلوق یعنی فرشتے بھی اس معرکہ کا مشاہدہ کرتے اور نتیجے کا بے تابی سے انتظار کرتے کہ کون فاتح اور کون مفتوح ٹھہرے گا۔ غرض کہ ملکہ صداقت شاہانہ وقار اور دبدبہ سے کامیابی کے یقین کے ساتھ دنیا میں آموجود ہوئی۔ ہر جگہ اس کا والہانہ استقبال ہوا یعنی لوگوں نے سچائی کو اختیار کیا اور اس پر ڈٹے رہے۔ لیکن دروغ چونکہ بہروپیہ تھا مختلف روپ دھار دھار کر لوگوں کو اپنے معاونین کی مدد سے اپنے فریب کے جال میں پھنسا کر وقتی طور پر صداقت کو شکست دینے کی کوشش کرتا اور کبھی کبھی وہ کامیاب بھی ہو جاتا اس کے پیر نہ جمتے۔

تشریح :

پیش نظر سطور میں آزاد کہتے ہیں کہ جب کبھی اتفاقاً سچ اور جھوٹ کا آمنا سامنا ہو جاتا اور معرکہ آرائی ہوتی تو دروغ اپنی حیثیت اور طاقت بڑھا چڑھا کر پیش کرتا تاکہ اس شور و غل سے سچ مرعوب ہو جائے ساتھ ہی شیخی اور فریب جیسی قوتوں کو ابھارتا تاکہ سچائی کے قدم اکھاڑنے میں وہ اس کی مدد کرے۔ دروغ صرف انہی دو قوتوں کا سہارا نہ لیتا بلکہ اسی طرح کی دوسری قوتوں مثلاً زبان درازی، بے شرمی اور بے غیرتی کو بھی متحرک کر دیتا اور انہیں کام لاتا۔ لالچ اور ہوس کے کاندھوں پر سوار ہو جاتا غرض دروغ ان شیطانی قوتوں کے ذریعے بھرپور حملے کرتا۔ دورانِ جنگ کبھی بھی ایک مخصوص مقام پر نہ ٹھہرتا، اپنے موقف میں تبدیلی کرتا رہتا اور غیر مستقل مزاجی کو اپنائے رکھتا۔ جوں ہی صداقت کی نظر اس پر اٹھتی اور اس کی حرکتوں پر دشمنانہ نظر ڈالتی تو دروغ فوراً سمجھ جاتا کہ اب اس کی خیر نہیں۔

اقتباس ۸ : ملکہ صداقت زمانی کبھی زخمی بھی ہوتی، مگر سانچ کو آنچ نہیں، زخم جلد بھر آتے تھے اور وہ جھوٹا نابکار جب زخم کھاتا تو ایسے سڑتے کہ اوروں میں بھی وبا پھیلا دیتے تھے۔ مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آ کودا۔

تشریح :

مولانا محمد حسین آزاد اس تمثیلی سبق کے آخر میں کہتے ہیں کہ سچائی کی ملکہ جنگ میں کبھی زخمی بھی ہو جاتی تھی مگر سچائی پر آنچ نہ آنے دیتی تھی اور اس کے زخم جلدی بھر جاتے تھے اور وہ جھوٹا دیوزاد جب زخمی ہوتا تو اس کے زخم ایسے سڑتے کہ جس سے دوسروں کو بھی بیمار کر دینے کا خطرہ پیدا ہو جاتا مگر اس کے زخم جب کچھ بہتر ہوتے وہ پھر سچائی کا سامنا کرنے کے لیئے میدان میں موجود ہوتا۔

اقتباس ۹ : ملکہ کی شان شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی مگر استقبال رکاب پکڑے تھا اور جو قدم اٹھتا تھا دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیا فرشتے بھی نہیں ہٹا سکتے تھے۔

تشریح :

مندرجہ بالا اقتباس میں مصنف نے سچائی کی ملکہ، ملکہ صداقت زمانی کی میدان جنگ میں آمد کا ذکر کیا ہے اور اس کی شان و شوکت بیان کی ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ سچائی و صداقت کی اس ملکہ کا مرتبہ نہایت ہی بلند ہے اور اس کی شان و شوکت آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ اس شخصیت کے پُرنور چہرے سے حق گوئی کا عکس نظر آتا ہے یہ نہایت آہستگی سے مستقل مزاجی سے اپنے قدم بڑھاتی ہے۔ اس کا منزل کی جانب ہر بڑھتا قدم اس بات کی بشارت دیتا کہ منزل دور نہیں ہے اور ایسا لگتا ہے مقصد حاصل ہو گیا ہے۔ یہ ملکہ ایک مرتبہ کسی جگہ پر اپنا پُرزور قدم جما دے تو اس قدر مستحکم ہوتا ہے کہ اس کو ہٹانا کسی انسان کے بس میں نہیں رہتا۔ اس مضبوط قدم کو فرشتے جیسی مخلوق بھی نہیں ہلا سکتی۔

اس عبارت میں مصنف نے ایک نہایت ہی قابل غور بات پیش کی ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ سچائی و صداقت ایک ایسی اٹل اور خوبصورت حقیقت ہے کہ ہر جگہ اس کا زور ہوتا ہے تمام عاقل و بالغ، ذہین و فطین لوگ سچائی کی بدولت ہیں اور سچ کو ایک اہم مرتبہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سچ کی ابتدا ہوتی ہے تو ہزاروں گواہیاں اس کے حق میں آتی ہیں۔ سچائی کا زور آہستہ آہستہ بلند ہوتا ہے اور بلند ہونے کے ساتھ ساتھ پوری طرح معاشرے میں سرایت کر جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں امن و سکون اور چین کی بانسری بجتی ہے اور تمام انسانوں کو ان کے مقصد کے حصول میں آسانی ہو جاتی ہے۔ صداقت کی مہک اگرچہ ایک مرتبہ پھیل جائے تو پورے گلشن کو دل نشین بنا دیتی ہے اور اس خوشبو کو کوئی بھی نہیں مٹا سکتا۔ یہ خوشبو ہر نئے آنے والے کے لیئے حصول منزل کی راہ ہموار کرتی ہے اور اس کی بدولت بندۂ مومن اطمینان و سکون کے ساتھ اپنا منشا حاصل کر لیتا ہے۔

تشکیل پاکستان

حوالہ سبق: یہ اقتباس سبق "تشکیل پاکستان" سے لیا گیا ہے۔

حوالہ مصنف: اس سبق کو میاں بشیر احمد نے تحریر کیا ہے۔

اقتباس ۱: **اس ناگفتہ بہ حالت میں ایک دوراندیش ہمدرد ملت اٹھا جس نے اپنی مایوس، پس ماندہ قوم کو امید، محنت اور ترقی کا زندگی بخش پیغام دیا۔ یہ مرد خدا سر سید احمد خان تھے۔ یہ انہی کی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ "ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں"۔**

ربطِ ماقبل:

ان سطور سے قبل میاں بشیر احمد نے اپنے مضمون میں بطور تمہید بتایا کہ اورنگ زیب کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد انیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کی تکمیل ہوگئی تھی۔ ۱۸۰۳ء میں دہلی میں انگریز کے داخلے اور مسلمانوں کی غلامی نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں نے انگریزوں کےخلاف بغاوت کی لیکن مسلمانوں کو ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ غدر دہلی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر ان کا سماجی، سیاسی اور معاشی لحاظ سے استحصال کیا جس کے نتیجے میں مسلمان سمجھ گئے کہ اب ان کا مستقبل تاریک ہے ان میں پژمردگی اور محرومی پیدا ہوگئی۔

تشریح:

پیش نظر سطور میں مصنف کہتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد مسلمانِ ہند انگریزی دباؤ اور ہندوؤں کی بے رخی کا شکار ہوئے اور ان میں یاسیت اور محرومی کا احساس بڑھنے لگا۔ مسلمانوں کی خستہ حالی، مردہ دلی اور احساس محرومی کے نتائج پر مسلمانوں کے رہنماؤں اور اہلِ دانش نے بھی اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔ انکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس گرداب سے کیسے نکلا جائے۔

چنانچہ اسی دل برداشتہ ماحول میں مسلمانوں کو غلامی سے چھٹکارا دلانے، ان میں سے ناامیدی کا احساس ختم کرنے کے لیئے اور کامیابی و آزادی کی راہیں سمجھانے کی خاطر ایک شخص جس کا نام سر سید احمد خان تھا، اٹھا جو ہمدردی کے احساس سے معمور دل اور ترقی و قومی خدمت کے جذبے سے لبریز ذہن کا حامل تھا۔ خدا نے اسے سوجھ بوجھ، تدبیر و تفکر، دور بینی اور دوراندیشی کی دولت سے مالامال کیا تھا۔ یہ عظیم ہمت و استقامت اسکی فطرت میں شامل تھی اس نے اپنی دوراندیشی سے مسلمانوں کی ٹوٹی ہوئی کشتی کو جوڑنے اور گرداب میں پھنسی ہوئی نیا کو کنارے لگانے کی منصوبہ بندی کی اور انہیں ناامیدی اور سستی و کاہلی کے بجائے محنت و مشقت کی طرف مائل کرنے کی بھرپور کوشش کی جو بلآخر کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور مسلمانِ ہند خواب گراں سے جاگ گئے۔

غرضیکہ مسلمان کچھ عرصے دوسروں کی غلامی میں تو رہے لیکن اس سے انہیں غلامی اور آزادی کا فرق پتہ چل گیا۔ انہوں نے محسوس کرلیا کہ غلامی سے بہتر موت ہے بلآخر وہ بیدار ہوگئے اور سر سید کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر آزادی کی منزل کی جانب گامزن ہوگئے۔

اقتباس ۲: **ان مساعی کا نتیجہ یہ ہوا مذہب سے بیگانگی بہت حد تک کم ہوگئی اور مغوب کی ذہنی غلامی سے نجات ملی۔ لیکن ساتھ ہی ایک ایسی فضا بھی پیدا ہوگئی جس میں اپنی ہر چیز بری لگنے لگی۔ اس کی اصلاح ضروری ہوگئی۔**

تشریح:

مسلمان علماؤں اور رہنماؤں کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی مذہب کی جانب سے لاپرواہی ختم ہوگئی۔ اور انگریزوں کی ذہنی غلامی سے چھٹکارا ملنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ برصغیر میں ایسا ماحول بنا جس میں مسلمانوں کو اپنی ہر چیز اچھی اور دوسروں کی ہر چیز بُری لگنے لگی۔ اس لیئے ایسے ماحول کی اصلاح بھی ضروری ہوگئی تھی، اسی ماحول میں علامہ اقبال نے آکر اصلاح کی کوشش کی، انہوں نے اسلامی علوم اور مغربی علوم کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا، اس لیئے انہوں نے اپنا خاص فلسفہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ اقبال کے فلسفے کا مطلب یہ تھا کہ ایک کامل ترین انسان میں ایسی صفات پیدا کرنا ہے جو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی نشوونما اور ترقی کا باعث بنے۔

اقتباس ۳ : اقبال کا خیال ہے کہ انسان اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی کی تین منزلیں طے کرتا ہوا خودی کی انتہائی منزل پر پہنچ سکتا ہے۔ اس ارتقاء میں اسے مذہب کی رہنمائی درکار ہے۔ اقبال نے چار چیزوں پر زور دیا۔ اول توحید جس پر پورا ایمان عملاً انسان کو خوف و مایوسی سے آزاد کر دیتا ہے نیز توحید الٰہی، توحید انسانی میں پر تو فگن ہوتی ہے۔ دوم رسول اکرم ﷺ سے محبت اور ان کی مکمل تقلید۔ سوم، قرآن کا مطالعہ اور اس کی تعلیمات کی پیروی۔ چہارم، رجائیت یعنی مایوسی اور غم پسندی کو ترک کر کے امید، ہمت اور جرأت کی راہ اختیار کرنا۔

تشریح :

علامہ اقبال کا خیال تھا کہ مسلمان اطاعت گزاری کے ذریعے اپنے نفس کو قابو میں کر کے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کی تین منازل طے کرتا ہوا ''خودی'' کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ سکتا ہے اس کے لیئے اسے مذہب کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال نے چار چیزوں پر زور دیا، پہلے نمبر پر توحید ہے جس پر پورا ایمان رکھنا ضروری ہے جو بندوں کو ہر قسم کے دنیاوی خوف اور مایوسی سے چھٹکارا دلا دیتا ہے۔ دوسرے نمبر پر رسول اکرم ﷺ سے محبت اور ان کی مکمل تقلید ہے۔ تیسرے نمبر پر قرآن کریم کا مطالعہ اور قرآنی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔ چوتھے نمبر پر مایوسی اور غموں کو چھوڑ کر نئی امید، ہمت اور جرأت کی طاقت سے کام لینا۔

اقتباس ۴ : پاکستان کے قیام سے نہ صرف ہندوستان اور ایشیاء میں بلکہ ساری اسلامی دنیا میں ایک ایسا قوت آفریں تغیر رونما ہو گیا ہے جس کے غیر معمولی نتائج کا دنیا ابھی صحیح طور پر اندازہ نہیں کر سکتی۔ ادھر یہ امر پاکستان کی ملت اسلامیہ پر روز بروز واضح ہو رہا ہے کہ اگر اسے اپنی اور دنیا کی طرف اپنا اسلامی اور انسانی فرض ادا کرنا ہے تو پاکستان کی حکومت لازمی طور پر اسلامی جمہوریت کے ترقی پرور اصولوں پر قائم ہوگی، جس میں مسلم اور غیر مسلم سے مساوی سلوک کیا جائے گا، جس میں بڑے بڑے سرمایا داروں کے لیئے جگہ نہ ہوگی، بلکہ جس میں غریبوں اور کارکنوں کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا، جس میں عورت کے حقوق اور اس کی شخصیت محفوظ ہوگی، جس میں دولت ادھر تمام لوگوں میں مناسب طور پر تقسیم ہو کر اور ادھر بیت المال میں جمع ہو کر عوام الناس کا معیار بڑھانے کے کام آئے گی۔

ربطِ ماقبل :

ان سطور سے قبل میاں بشیر نے ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کا نقشہ کھینچتے ہوئے ان کی غلامی، انگریزوں کی حکمرانی اور ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں پر اس کے مرتب ہونے والے اثرات بیان کیئے ہیں۔

مسلمان قوم کو پستی، ذلت اور رسوائی کے اندھیروں سے نکالنے میں سرسید اور انکے رفقاء کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی نیشنل کانگریس کی بنیاد مسلمانوں کے خلاف اسکی منصوبہ بندی، سرسید کا کانگریس اور ہندوؤں کے رویے سے اختلاف کے علاوہ ان اداروں اور تحریکات (مثلاً علی گڑھ، دیوبند، ندوہ وغیرہ) کا ذکر کیا ہے۔ جنہوں نے مسلمانوں کو سیاسی، معاشی، مذہبی اور معاشرتی طور پر بیدار کیا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے تحریک پاکستان میں مسلم لیگ اور اس کے رہنما قائداعظم کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کی قربانیوں اور جدوجہد کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ قیام پاکستان کے دوران پیش آنے والے واقعات بیان کیئے ہیں۔

تشریح :

پیش نظر سطور میں مصنف لکھتے ہیں کہ پاکستان کے قیام نے ایشیا بلکہ ساری دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے خصوصاً مسلمان تحریکوں اور اسلامی دنیا کو ایک قوت بخش ولولہ آزادی کا حوصلہ ملا۔ قیام پاکستان اسلامی دنیا کے لیئے باعث رحمت ہی نہیں بلکہ اس کے اثرات دنیا کی دوسری اقوام میں بھی محسوس کیئے جائیں گے۔

پاکستان کو ملت اسلامیہ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اسے پوری دنیا کی قیادت کے فرائض انجام دینے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے لیئے مینارہ نور بن گیا پس پاکستان کی حکومت پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اسلامی نظریہ حیات اور سماجی حیات کو اس طرح قائم کرے کہ وہ دنیا کے لیئے نمونہ بن سکے۔

تحریک پاکستان کے دوران ہی پاکستان کے نصب العین اور مقاصد کو واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ ایسی مملکت ہوگی جس میں ہر شہری خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو یکساں انسانی سلوک کیا جائے گا، ہر قسم کے ظلم کا خاتمہ ہوگا۔ حقوق نسواں کا پورا احترام کیا جائے گا۔ سرمایہ دار، مزدور، کسان، غریب اور امیر سب کے حقوق کا تحفظ کیا جائیگا۔ غرض ہر شخص کو ترقی کے یکساں مواقع میسر کیئے جائیں گے تاکہ عوام اپنا معیار زندگی آزادانہ طور پر بلند کر سکیں۔

اقتباس ۵ : مسلمانوں کا نصب العین اسلام ہے۔ وہ اسلام نہیں جس کا ڈنکا مطلق العنان بادشاہوں اور خود غرض امراء نے بجایا بلکہ وہ اسلام جس حامل قرآن ہے، جس نے صرف ان دیکھے خدا کے آگے سر جھکانا سکھایا، وہ اسلام جس کا نمونہ آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین کے عہد میں مسلمانوں کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ وہ سچائی، وہ دلیری، وہ خود اعتمادی، وہ انکسار و امن پسندی، وہ محنت و مساوات، وہ صبر و تقویٰ، وہ مسلم و غیر مسلم، سب کی خدمت، سب کے حقوق کا تحفظ، سب سے رواداری اہو محبت یہ ہے پاکستان کے مسلمانوں کا نصب العین۔

ربطِ ماقبل :

ان سطور سے قبل میاں بشیر نے ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کا نقشہ کھینچتے ہوئے ان کی غلامی، انگریزوں کی حکمرانی اور ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں پر اس کے مرتب ہونے والے اثرات بیان کیئے ہیں۔

مسلمان قوم کو پستی، ذلت اور رسوائی کے اندھیروں سے نکالنے میں سرسید اور انکے رفقاء کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی نیشنل کانگریس کی بنیاد مسلمانوں کے خلاف اسکی منصوبہ بندی، سرسید کا کانگریس اور ہندوؤں کے رویے سے اختلاف کے علاوہ ان اداروں اور تحریکات (مثلاً علی گڑھ، دیوبند، ندوہ وغیرہ) کا ذکر کیا ہے۔ جنہوں نے مسلمانوں کو سیاسی، معاشی، مذہبی اور معاشرتی طور پر بیدار کیا ہے۔

ساتھ ہی انہوں نے تحریک پاکستان میں مسلم لیگ اور اس کے رہنما قائداعظم کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کی قربانیوں اور جدوجہد کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ قیام پاکستان کے دوران پیش آنے والے واقعات بیان کیئے ہیں۔

ان سطر سے قبل خاص طور پر دو قومی نظریے کے حوالے سے ان باتوں کو بیان کیا گیا ہے جسکو بنیاد بنا کر ہم پاکستان بنانا چاہتے تھے۔ مثلاً ساجی معاشی اور مذہبی انصای کی فراہمی۔

تشریح :

پیش نظر سطور سبق کا آخری حصہ ہے۔ جس میں مصنف نے اسلامی نظریات اور مسلمانوں کے نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام کے بارے میں یہ تصور غلط ہے کہ یہ امراء اور بادشاہوں کا مذہب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک ضابطہ حیات ہے جو کہ قرآن پر مبنی ہے اور جاہلوں، ظالموں، مفاد پرستوں اور امراء کے اذہان کی پیداوار نہیں۔ اسلام ایک الہامی دین ہے جس میں انسانیت کی بھلائی کا ذکر مضمر ہے اس کا مخاطب ہر انسان ہے۔ اسلام تمام جھوٹے دنیاوی خداؤں سے منہ موڑ کر اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے، اسے کائنات کا حاکم مطلق جاننے، قرآن مجید کو انسانی ضابطہ حیات سمجھنے، رسول اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے جانثار صحابہ کرامؓ سے محبت و الفت رکھنے اور انکی مکمل پیروی کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

مسلمان حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی صفات کا امین ہوتا ہے۔ خود اعتمادی یعنی اپنی ذات پر بھروسہ اسکا جوہر، انکساری، عاجزی، اور امن پسندی اسکا شیوہ، جہد و عمل اور سعی اس کی عادت، صبر و تقویٰ اور پرہیزگاری، اس کا سب سے مساوی سلوک، اس کا نعرہ، رواداری، حسنِ سلوک اور خدمتِ خلق اس کی فطرت، ہر ایک سے محبت اور ہر ایک کے حقوق کا تحفظ اس کا ایمان ہے۔ یہی لوازماتِ مومن ہیں جو پاکستان کے مسلمانوں کا نصب العین اور شعار ہے۔

اقتباس ۶: سرسید کے بعد ان کے رفقاء نے ان کا شاندار کام جاری رکھا۔ محسن الملک، وقار الملک، حالی، نذیر احمد، ذکاءاللہ، شبلی وغیرہ نے تعلیمی، سیاسی اور ادبی خدمات سرانجام دیں۔ محسن الملک نے علی گڑھ کالج کو ترقی دی۔ وقار الملک ایک سیاسی جماعت کی تشکیل میں معاون ہو جائے۔ حالی کی "مسدس" نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب کی لہر دوڑا دی، شبلی نے اسلامی تاریخ کے آئینے میں انہیں اپنی گزشتہ عظمت دکھا کر ان کے دلوں کو گرما دیا۔ امیر علی نے اپنی انگریزی تصانیف سے مغربی حلقوں میں اسلام کی وقعت پیدا کی۔

تشریح :

سرسید احمد خان کے انتقال کے بعد ان کے دیرینہ ساتھیوں نے ان کے بے مثال کام کو جاری رکھا۔ ان کے رفقاء میں محسن الملک، وقار الملک، حالی، نذیر احمد، ذکاءاللہ اور شبلی نعمانی وغیرہ شامل تھے۔ انہوں نے تعلیم، سیاست اور ادب کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان میں نواب محسن الملک نے علیگڑھ کالج کو ترقی دی،

وقار الملک نے مسلمانوں کی سیاسی جماعت بنانے میں مدد کی۔ جبکہ مولانا الطاف حسین حالؔی نے اپنی مشہور مسدس حالی کے ذریعہ مسلمانوں کے ساندار ماضی کو یاد دلانے کی کوشش کی۔ مسدس حالی نے مسلمانوں میں انقلابی بیداری کی لہر دوڑادی۔ علامہ شبلی نعمانی نے اسلامی تاریخ کے سنہرے باب مسلمانوں کے سامنے آشکار کیے۔ شبلی کی تحریروں نے بھی مسلمانوں کے دلوں کو تڑپا کر رکھ دیا۔ سید امیر علی نے بھی اپنی انگریزی زبان کی مہارت کا فائدہ اٹھایا اور اسلام کے خلاف انگریزوں کے پروپیگنڈے کا ان ہی کی زبان میں مدلل جواب دے کر اسلام کی صحیح روح کو اُجاگر کیا جس سے کعرب کے لوگوں میں اسلام کا صحیح رُخ سامنے آیا۔

اقتباس ۷: **علیگڑھ تحریک کی وجہ سے قوم میں کئی اور تحریکات شروع ہوگئیں۔ اختلافات ضرور رونما ہوئے لیکن ایک حد تک یہ نئی زندگی کا نشان تھے۔ سرسید ،امیر علی اور دیگر بزرگوں نے اسلام کو مغربی علوم سے اس طرح جا ملایا تھا کہ اسے ایک ترقی یافتہ مذہب ثابت کیا۔ لیکن اس جدید علم الکلام کے ردعمل کے طور پر بعض اور مذہبی مسائل بروئے کار آئیں۔**

تشریح:

علی گڑھ تحریک کیا شروع ہوئی دوسری تحریکوں نے بھی سامنے آنا شروع کر دیا، مثلاً جامعہ ملیہ دہلی، ندوۃ العلماء جیسی تحریکیں منظر عام پر آگئیں گو کہ ان میں اختلافات بھی ضرور ہیں مگر یہ اختلافات سیاسی زندگی کی پہچان ہوا کرتے ہیں۔ سرسید، امیر علی اور دیگر ساتھیوں نے اسلام اور مغربی علوم کو ملا کر ایک ترقی یافتہ مذہب بنا دیا لیکن اس جدید علم الکلام کے ردِعمل کے سلسلے میں بعض اور مذہبی کوششیں بھی منظر عام پر آتی رہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے لکھنؤ میں اسلامی تعلیم کے لیئے ندوۃ العلماء قائم کیا جبکہ دیو بند علماء نے قدیم طرز کی اسلامی درسگاہ قائم کر کے اسلامی علوم کی شاندار روشنی کو بجھنے نہ دیا۔

ایک شام ماضی کی محرابوں میں

حوالہ سبق: یہ اقتباس سبق "ایک شام ماضی کی محرابوں میں" سے لیا گیا ہے۔

حوالہ مصنف: یہ سفرنامہ ابنِ انشاء نے تحریر کیا ہے۔

اقتباس ا: **سامنے اس فاتح کی آرام گاہ تھی جس کے پرچم کے آگے مشرق اور مغرب سرنگوں تھے۔ جس نے یورپ کے متحدہ لشکروں کا سامنا کیا اور اپنی فتوحات اور حسن اخلاق کی داستانیں چھوڑ گیا۔ آج جب کہ سرزمین شام کے ایک کونے اور بیت المقدس کو غاصبوں نے دبا رکھا تھا اور فلسطین کے مہاجر صحرا میں دربدر پھر رہے تھے۔ یہ فاتح لمبی تانے سو رہا تھا۔ ہم نے کہا اے غازی! اٹھ کہ اب نہیں اٹھے گا تو کب اٹھے گا کیا خوب قیامت کا بھی کوئی دن ہوگا؟**

تشریح:

مندرجہ بالا اقتباس اس وقت کا ذکر کر رہا ہے جب وہ سلطان صلاح الدین کے مزار میں داخل ہوتا ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ جب وہ چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو سامنے مسلمانوں کے عظیم فاتح سلطان صلاح الدین کی قبر تھی۔ جس میں وہ آرام فرما رہے تھے۔ مصنف کہتا ہے کہ یہ وہ عظیم ، بے باک اور مخلص مجاہد دین جس کی بہادری و سرفروشی کی داستانیں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور جس کی عظمت کا اعتراف ہر قوم اور ہر دور کے لوگوں نے کیا ہے۔ یہی وہ مرد مجاہد ہے جو سلطانی امت کا سربراہ رہا ہے اور جس کے دور میں مسلمانوں نے کفار و مشرکین کے بڑے بڑے لشکروں کو شکستِ فاش دی۔ اس باہمت رہنما کی بدولت ہی مسلمان اس کرۂ ارض کے کونے کونے میں پھیل گئے۔ اور دشمنانِ دین پر اسلام کی دھاک اور اسلام کا رعب و دبدبہ بیٹھ گیا
مشرکین و عیسائی اس مردِ مجاہد سے اس قدر خوفزدہ ہوگئے کہ لوگوں سے اس نام لے کر جنگ کے لئے مالِ غنیمت لے جایا کرتے۔ یہ بہادر انسان جہاں جہاں اسلام کے نام پر امن کے جھنڈے گاڑتا وہاں وہاں اس کے حسنِ اخلاق کی داستانیں مشہور ہوجاتیں۔ اس کا بے داغ کردار ہی مسلمانوں کے حسنِ اخلاق اور بلند کردار کی ضمانت بنا۔

مصنف یہ عظیم والشان تاریخ بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ دورِ حاضر میں بھی امت مسلمہ کو ایسے ہی مومن کی ضرورت ہے جو دنیا کے بے گھر اور پستی میں گھرے ہوئے مسلمانوں کو دوبارہ عظمتِ رفتہ کی طرف لوٹا دے اور یہ ملت ایک بار پھر دنیا کی امامت کا منصب سنبھال لے۔ فلسطین میں جس طرح مسلمانوں کو بے دردی سے بے گھر کیا گیا اور بیت المقدس پر یہودیوں نے جس ہٹ دھرمی سے قبضہ کیا وہ مسلمانوں کو للکار للکار کر کہہ رہا ہے کہ ہے کہ یہ غازی جوا ٹھے اور اپنی مدد کرے۔ اس قوم کو ذہنی و جسمانی غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرائے۔

مصنف کے ذہن میں یہ تمام واقعات بالکل واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں اور وہ جوش وجذبات میں بے اختیار اس عظیم رہنما سے مخاطب ہو جاتے ہیں کہ اے فاتح! مسلمانوں کا اب بہت برا حال ہے۔ دنیا بھر میں جگہ جگہ اللہ کے بندے تیرے منتظر ہیں۔ اتنے ظلم وستم ہیں گویا قیامت کے مناظر ہمارے سامنے گھوم رہے ہیں۔ قیامت کے روز تو سب کو دوبارہ اٹھایا جائے گا تو کب اٹھے گا کو قیامت بھی آ پہنچی ہے۔

اقتباس ۲: مشرقی دروازے سے نکلیں تو باہر پھر اونچی شکستہ محرابیں دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے ہلاکو کی یورش بھی دیکھی ہوگی۔ تیمور کی بھی۔ یہی وہ مشرقی منارہ ہے جس پر ایک روایت کے بموجب قیامت کے حضرت عیسیٰؑ اتریں گے۔ بائیں ہاتھ کو مڑیئے تو سلطان صلاح الدین غازیؒ کی تربت کا قبہ سامنے تھا۔ ایک چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ وہاں ایک بزرگ بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ ایک نوجوان نے اٹھ کر دوسرا دروازہ کھولا اور سامنے اس فاتح کی آرام گاہ تھی جس کے پرچم کے آگے مشرق اور مغرب سرنگوں تھے۔ جس نے یورپ کے متحدہ لشکروں کا سامنا کیا اور اپنی فتوحات اور حسن اخلاق کی داستانیں چھوڑ گیا۔ آج جب کہ سرزمین شام کے ایک کونے اور بیت المقدس کو غاصبوں نے دبا رکھا تھا اور فلسطین کے مہاجر صحراؤں میں دربدر پھر رہے تھے۔ یہ فاتح لمبی تانے سو رہا تھا ہم نے کہا اے غازی! اٹھ کہ اب تو نہیں اٹھے گا تو کب اٹھے گا۔ کیا خوب قیامت کا بھی ہوگا کوئی دن اور؟

تشریح:

جامع مسجد دمشق کے مشرقی دروازے سے باہر نکلیں تو اونچی اونچی پرانی محرابیں نظر آنے لگتی ہیں۔ ان محرابوں نے مشہور جنگ جو ہلاکو خان اور تیمور کے دمشق پر حملے بھی ضرور دیکھے ہوں گے۔ یہیں وہ مشرقی منارہ ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ یہاں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قیامت سے پہلے ظاہر ہوں گے۔ اس جگہ سے الٹے ہاتھ پر رخ کریں تو مشہور مسلم جرنیل سلطان صلاح الدین ایوبی کے مزار کا گنبد بھی نظر آنے لگے گا۔ مزار کے چھوٹے سے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ وہاں ایک بزرگ قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف تھا۔ دوسرے نوجوان نے دروازہ کھولا اور ہمارے سامنے مشہور فاتح صلاح الدین ایوبی کی قبر مبارک تھی۔ جس کے پرچم کے سامنے مشرق اور مغرب جھکے ہوئے تھے۔ اسی جرنیل نے صلیبی جنگوں میں یورپ کی متحدہ افواج کا مقابلہ کیا اور اپنی فتوحات سمیت اپنے حسن اخلاق کی کئی کہانیاں بھی چھوڑ گیا، موجودہ دور میں جب ملک شام کے ایک حصے "بیت المقدس" پر یہودیوں نے قبضہ کر رکھا ہے اور فلسطین کے رہنے والوں کو دربدر کر دیا ہے تو یہ عظیم فاتح قبر میں آرام کر رہا ہے۔ ہم نے کہا اے غازی یعنی ہمیشہ زندہ رہنے والے اب اٹھ جا نہیں اٹھے گا تو کب اٹھے گا۔ کیا قیامت کا دن کوئی اور ہوگا۔

اقتباس ۳: فاتحہ سے فارغ ہو کر ہم پھر نکلے۔ گھوم کر مغربی دروازے سے دوبارہ مسجد میں داخل ہوئے۔ اب گائیڈ صاحب باہر کھڑے رہے۔ ہم نے پھر ایک بار نگاہوں کو اس رواقِ کہنہ کے نظارے سے سیراب کیا۔ ایک بار پھر مزار حضرت یحییٰ علیہ السلام پر بیٹھے اور تصور کیا کہ ہمارے شیخ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ بھی یہیں معتکف ہوتے ہوں گے اور اس سامنے کے دروازے سے وہ لولا لنگڑا آدمی داخل ہوا ہوگا جسے دیکھ کر شیخ اپنے پاؤں میں جوتا نہ ہونے کا غم بھول کر رب کا شکر ادا کرنے لگے کہ جوتا نہ سہی میرے پاؤں تو ہیں۔ ورنہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاؤں نہیں۔ ہم نے بھی شکر ادا کیا کہ ہوس کی انتہا نہیں۔ قسامِ ازل نے ہمیں پہلے ہی حصے سے زیادہ دے رکھا ہے۔

تشریح:

دعا سے فارغ ہونے کے بعد مغربی سمت کے دروازے سے گھوم کر پھر مسجد میں داخل ہوئے۔ گائیڈ باہر ہی کھڑا رہا، ہم نے ایک بار پھر اپنی چشم تصور سے ان پرانے کمروں یا حجروں کا نظارہ کیا، جن میں قدیم زمانے میں تا لبعلم رہا کرتے تھے۔ اس نظارے سے ہماری آنکھیں بھر آئیں۔ ایک بار پھر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مزار پر حاضری دی اور پھر چشم تصور میں حضرت شیخ سعدیؒ کو اس مزار کے آس پاس اعتکاف کرتے ہوئے دیکھا۔ اور شیخ سعدیؒ کی حکایت کے مطابق اس ہاتھوں پاؤں

سے معذور شخص کو بھی دروازے سے اندر آتے دیکھا جسے دیکھ کر شیخ سعدی کا اپنے پاؤں میں جوتا نہ ہونے کا غم بھول گئے اور اللہ کا شکر ادا کرنے لگے کہ جوتا نہ ہی میرے پاؤں تو سلامت ہیں ورنہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاؤں نہیں ہیں۔ ہم نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا کہ لالچ کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اللہ کی ذات نے ہمیں پہلے سے ہی کچھ زیادہ دے رکھا ہے۔

میکسیکو سٹی اور میں

حوالہ سبق: زیرِ نظر اقتباس ''محترمہ بیگم ریاض الدین'' کے سفرنامے سے لیا گیا ہے۔

حوالہ مصنف: یہ سفرنامہ ''میکسیکو سٹی اور میں'' سے ماخوذ ہے جو ان کی مشہور کتاب ''دھنک پر قدم'' سے لیا گیا ہے۔

اقتباس ۱: شہر کا ظاہری شور و شغب جب ذرا ہلکا ہوتا ہے تو اس کا باطن آہستہ آہستہ ابھرتا ہے۔ کسی بھی ملک کے انسان اس کی اصلیت ہوتے ہیں۔ ہوائی اڈے پر یا ہوٹلوں میں جو نمونے نظر آتے ہیں ان کی پلاسٹک کی مسکراہٹیں ہوتی ہیں۔ مصنوعی پلکوں کی طرح جھپاکے میں اترتی چڑھتی رہتی ہیں۔ لیکن سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے، باغوں میں لیٹے، زمین دوز مرمتوں میں جتے ہوئے، دیہاتوں سے پوٹلے اٹھائے اور بھٹے کھاتے ہوئے، تین تین بچوں کو کندھوں پر اٹھائے گاتے ہوئے جو لوگ دکھائی دیتے ہیں وہ ہیں کسی شہر کا باطن۔ میکسیکو کا باطن خوش مزاج نظر آیا۔ یہاں عام لوگ غیر مانوس چہروں خصوصاً عورتوں کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ شرماتے اور سراہتے بھی ہیں۔

تشریح:

میکسیکو سٹی کا دیکھنے والا شور و غل جب ذرا کم ہونے لگتا ہے تو اندرونی کیفیت ظاہر ہونے لگتی ہے۔ ہر قوم کے لوگ اس کی شناخت ہوتے ہیں۔ ایئرپورٹ اور ہوٹلوں پر جو لوگ ڈیوٹی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی مسکراہٹ مصنوعی ہوتی ہے، جو مصنوعی پلکوں کی طرح لمحوں میں اترتی ہیں اور پھر بکھرتی ہیں لیکن سڑکوں پر چلتے ہوئے، باغوں میں لیٹے ہوئے زمینوں پر کام کرتے ہوئے، دیہاتیوں سے سامان کے بنڈل اٹھائے اور راہ چلتے ہوئے بھٹے کھاتے ہوئے اور تین تین بچوں کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے اصل لوگ ہوتے ہیں اور اس شہر کی اندرونی سچائی کو بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ میکسیکو سٹی کی اندرونی سچائی خوش مزاج دکھائی دی، یہاں کے عام لوگ اجنبی لوگوں بالخصوص اجنبی عورتوں کو دیکھ کر مسکراتے ہیں، شرماتے اور تعریف کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں کچھ سمجھ نہیں آتا کہ وہ ہماری تعریف کر رہے ہیں یا مذاق اڑا رہے ہیں۔ میری ساڑھی تو ان کے لئے عجیب تھی اس سے زیادہ میری بچیوں کی شلوار قمیض بھی ان کے لئے کسی عجوبے سے کم نہ تھی۔ کئی مقامات پر لوگوں کا رش لگ جاتا اور جب ان کے قریب جاتے تو وہ گردن نیچے کر کے ادھر ادھر ہو جاتے۔

اقتباس ۲: ہسپانوی خون کے باعث ان میں ''شی ولری'' نمایاں ہے۔ مگر انڈین قبائلی جھجک اور حجاب بھی شامل ہے۔ دیہاتوں کی بے روزگاری دیہی آبادی کو شہروں کی طرف دھکیل رہی ہے۔ اس لئے ہر قدم پر آپ کا تھیلا اٹھانے کے لئے چار مزدور تیار ہیں۔ بھکاری بھی ہیں مگر خاموش آپ کی بوٹیاں نہیں نوچتے۔ اسی لئے اس ملک میں خیرات دینے کو میرا دل چاہتا تھا۔ بوڑھی عورتیں جگہ جگہ لاٹری بیچ رہی ہیں۔ بوڑھے بوٹ پالش کر رہے ہیں۔

تشریح:

ہسپانوی خون شامل ہونے کی وجہ سے ان میں بہادری اور جرأت مندی کی خصوصیت نمایاں ہے۔ مگر ان میں ریڈ انڈین قبائل کی جھجک اور حجاب بھی شامل ہے۔ دیہاتوں میں بے روزگاری بہت ہے، جس کی وجہ سے دیہاتوں سے شہروں کی طرف نقل مکانی کا سلسلہ یہاں بھی جاری ہے، جس کی وجہ سے ہم کو ہر جگہ ایک کام کے لئے چار چار مزدور تیار ملیں گے۔ فقیر بھی بہت ہیں مگر خاموش رہتے ہیں لوگوں کو بھلا برا کہتے، طعنے دیتے نظر نہیں آتے۔ اس لئے اس ملک میں خیرات دینے کو سب کا دل چاہتا ہے۔ بوڑھی عورتیں بھی لاٹری بیچ رہی ہیں اور بوڑھے جوتوں پر پالش کر کے روزی کما رہے ہیں۔

مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم

حوالہ سبق: زیرِ نظر اقتباس "مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم" کے سفرنامے سے لیا گیا ہے۔

حوالہ مصنف: اس سبق کے مصنف کا نام شبلی نعمانی ہے۔

اقتباس ۱: ۱۴۵ھ تک یعنی جب تک تصنیف و تالیف شروع نہیں ہوئی تھی جو تعلم و تعلیم تھی وہ عرب کے سادہ اور نیچرل طرزِ زندگی کے لیے موزوں تھی۔ علوم وہ تھے جن کو حافظے سے زیادہ تر تعلق تھا۔ بحث طلب مسائل معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے اور طرزِ تعلیم تو بالکل وہ ہی تھا (سند و روایت) جو قدیم زمانے سے ان میں رائج تھا۔

تشریح:

شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ ۱۴۵ھ تک علم کو باقاعدہ کتابت و اشاعت اور ضابطہ تحریر میں لا کر محفوظ کر کے لوگوں تک منتقل کرنے کا رواج نہ ہو پایا تھا اسلیئے علم کو ذہن در ذہن ہی منتقل کیا جاتا تھا۔ عرب خصوصاً مسلمانوں میں تعلیم و تدریس کا جو قاعدہ رائج تھا وہ فطری تھا۔ ماحول کی مناسبت سے سیدھا سادہ طریقہ تدریس قائم تھا جس میں حافظے کا مکمل عمل دخل تھا۔ یادداشت کی قوت کو بروئے کار لا کر علم ایک ذہن سے دوسرے ذہن منتقل کیا جاتا تھا۔ ہر بات پر گفتگو، بحث و مباحثہ، ہر پہلو پر غور و فکر اور روشن و تاریک پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہر خاص و عام کی عادت تھی۔

غرض یہ کہ ۱۴۵ھ کے آخر تک طرزِ تعلیم اسی قدیم طرز و انداز کا حامل تھا جو گزشتہ میں رائج تھا۔ جس میں حکماء، مفکرین اور اہلِ دانش کے اقوال و بیانات کو موضوع بنایا جاتا جو دلائل کے ساتھ قابلِ قبول رہے ہوں۔

اقتباس ۲: لیکن سو برس کی مدت میں تمدن بہت کچھ ترقی کر گیا اور اسی نسبت سے ان میں تعلیم میں زیادہ وسیع اور مرتب و باقاعدہ ہو چلی۔ اس دور میں جن علوم کو رواجِ عام حاصل ہوا وہ نحو، معانی، لغت، اصولِ حدیث، فقہ، تاریخ، اسماء الرجال، طبقات اور ان کے متعلقات تھے۔ عقلی علوم کا سرمایہ بہت کچھ جمع ہو گیا تھا مگر رواجِ عام نہ حاصل کر سکا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت نے اس کی اشاعت پر چنداں زور نہ دیا اور ملکِ عام کو کچھ نہ واقفیت، کچھ مذہبی غلط فہمی کی وجہ سے فلسفہ، منطق سے ہمدردی نہ تھی۔

ربطِ ماقبل:

ان سطور سے قبل شبلی نے لکھا ہے کہ ۱۴۵ھ تک تمام علوم کی تعلیم و تدریس میں حافظے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور علم کو ذہن در ذہن منتقل کیا جاتا تھا۔ نصاب میں حکماء اور مفکرین کے اقوال و بیانات شامل تھے۔

تشریح:

شبلی کہتے ہیں کہ ۱۴۵ھ کے بعد سو سال کے عرصے میں مفکرین کے اقوال و بیانات کے علاوہ جن علوم کو ترقی ہوئی ان میں قواعد کا علم ضروری سمجھا جانے لگا۔ علم معانی یعنی الفاظ کے مفہوم کو سمجھنا علیحدہ مضمون قرار پایا۔ احکامِ شریعت کے علم نے علمِ فقہ کے نام سے جدا حیثیت حاصل کر لی۔ اقوالِ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی جگہ ایک جامع شعبہ علم کی حیثیت اختیار کر لی۔ تاریخ کا علم بھی متاثر ہوا۔ مختلف ذرائع سے پیش کی جانے والی احادیثِ رسول ﷺ کی صحت کو پرکھنے اور روایوں کے حافظے و نسیان اور سیرت و کردار کو جانچنے کا عمل اور ان سے احادیث کا معیار قائم کرنے کا تحقیقی علم بڑی اہمیت اختیار کر گیا۔ ان علوم کے دوش بدوش سماجی درجہ بندی و معیشت اور ہم رشتہ امور کو شعبہ علم کا درجہ دے دیا گیا۔

مسلمانوں کے پاس اہلِ گزشتہ کی سرمایہ کی حیثیت سے عقلی و نظری علوم کا بڑا خزینہ تھا لیکن مذکورہ بالا شعبہ ہائے علوم کے مقابلے میں یہ زیادہ مقبولیت و اہمیت کی حامل نہ ہو سکی اس کی وجہ یہ تھی کہ سرکاری سطح پر علم کی اشاعت کی کوئی خاص سرپرستی نہ تھی اور نہ ہی عام لوگوں کی توجہ اس جانب مبذول تھی۔ اس کے علاوہ کچھ علوم کو مذہبی لحاظ سے ناقابلِ توجہ سمجھا گیا مثلاً فلسفہ منطق (عقلی علوم) جسکی وجہ سے ان کی ترقی نہ ہو سکی۔

اقتباس ۳: دیکھو دریائے سندھ کنارے تک اسلام حکومت کر رہا۔ حجازی فتوحات کا سیلاب اب رک چلا ہے۔ مفتوحہ ممالک میں امن و انتظام کا عمل ہو جاتا ہے۔ سینکڑوں قبیلے ریگستان عرب سے نکل کر دور دراز ملکوں میں آباد ہوتے جاتے ہیں۔ بہت سی نئی قومیں دلی ذوق سے اسلام میں شامل ہو رہی ہیں۔ لیکن اب تک اس وسیع دنیا میں سلطنت کی طرف سے نہ کوئی سر رشتہ تعلیم ہے نہ یونیورسٹیاں، نہ مدرسے ہیں۔ عرب کے نسلی حکمراں ہیں مگر حکومت ایسی بے تعلق اور اوپری ہے کہ ملک کے عام اخلاق، معاشرت، تمدن پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر چنداں نہیں پڑ سکتا۔ تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی ہے۔ ان سب باتوں پر دیکھو کہ علوم فنون کس تیزی اور وسعت سے بڑھتے جاتے ہیں۔

ربطِ ماقبل:

اس سطور سے قبل شبلی نے لکھا ہے کہ ۱۴۵ تک تمام علوم کی تعلیم و تدریس میں حافظے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور علم کو ذہن در ذہن منتقل کر دیا جاتا تھا۔ نصاب میں حکماء اور مفکرین کے اقوال و بیانات شامل تھے۔ لیکن اس کے علاوہ جن علوم کو ترقی حاصل ہوئی ان میں قواعد کا علم ضرور سمجھا جانے لگا۔ علم معانی یعنی الفاظ کے مفہوم کو سمجھنا علیحدہ مضمون قرار پایا۔ احکامِ شریعت کے علم نے علم فقہ کے نام سے جدا حیثیت حاصل کر لی۔ اقوالِ رسول اکرم ﷺ نے اپنی جگہ ایک جامع شعبہ علم کی حیثیت اختیار کر لی۔ تاریخ کا علم بھی متاثر ہوا۔ مختلف ذرائع سے پیش کی جانے والی احادیثِ رسول ﷺ کی صحت کو پرکھنے اور روایوں کے حافظے و نسیان اور سیرت و کردار کو جانچنے کا عمل اور ان احادیث کا معیار قائم کرنے کا تحقیقی علم بڑی اہمیت اختیار کر گیا۔ فلسفہ و منطق پر بے توجہی برتی گئی۔

تشریح:

پیشِ نظر میں انہوں نے ایسا بیانیہ انداز اختیار کیا کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اس دور میں موجود تھے اور سب کچھ ان کے سامنے ہو رہا تھا۔

وہ فتوحاتِ اسلامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مجاہدینِ اسلام کی یلغار مکہ و مدینہ سے شروع ہوئی تھی۔ وہ بڑھتے بڑھتے دریائے سندھ کے کنارے تک پہنچ چکی تھی۔ دنیا کے طویل خطے پر پرچم ہلالی لہرا رہا تھا اب مزید فتوحات کا سلسلہ رک چکا تھا۔ اور مفتوحہ علاقوں میں مسلمان قیامِ امن کی کوششوں میں مصروف تھے۔ تاکہ مفتوحہ علاقوں میں ان کی حکمرانی کی جڑیں مضبوط ہو سکیں۔ اور کوئی انتشار اور افتراق اور فساد و بغاوت سر نہ اٹھا سکے اور عوام چین کی زندگی بسر کر سکیں۔

اس سلسلے میں جگہ جگہ مجاہدین کے ساتھ آنے والے قبیلے رہائش اختیار کر رہے تھے۔ اسلام کی برکتیں عام ہو رہی تھیں، لوگ اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی سیرت و کردار سے متاثر ہو کر جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔

اسلامی مملکتوں کے قیام اور دنیا کے وسیع و عریض خطے میں مسلمانوں کی حکمرانی اور سیاسی بالادستی قائم ہونے کے باوجود حکمرانوں نے تعلیم کی ترقی کی کوئی منصوبہ بندی نہ کی۔ ان کی حکومتوں میں دورِ حاضر کی طرح کوئی محکمہ تعلیم قائم نہ تھا، نہ ہی باقاعدہ درسگاہوں کا جال بچھایا گیا تھا۔ جس سے علم حاصل کرنے والے اپنے علم کی پیاس بجھا سکتے۔

غرض مسلمان حکمرانوں کی عدم توجہی کی وجہ سے اسلام کے نظامِ اخلاق، نظامِ معاشرت اور انکی تہذیب و تمدن کے اثرات مقامی رعایا پر مرتب نہ ہو سکے۔ اب تمام ریاستوں جہاں مسلمان حکمران تھے۔ تدریسی علوم کی زبان عربی تھی، حکمرانوں کی عدم دلچسپی اور مقامی زبان میں تدریس نہ ہونے کے باوجود علوم و فنون تیز رفتاری سے ترقی کے مراحل طے کر رہے تھے اور لوگ علم کے حصول میں بے پناہ دلچسپی کا مظاہرہ کر رہے تھے جسکی وجہ سے ہر جگہ علم کا دور دورہ تھا۔

اقتباس ۴: ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی صداؤں سے گونج اٹھا ہے۔ عام تعلیم کے لئے ہزاروں مکتب قائم ہیں جن میں سلطنت کا کچھ حصہ نہیں ہے اور جو آجکل کے تحصیلی مدارس سے زیادہ مفید اور فیاض ہیں، اوسط اور اعلی تعلیم کے لئے مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے، علماء کے ذاتی مکانات ہیں۔ لیکن ان سادہ اور بغیر تکلف عمارتوں میں جس وسعت اور فیاضی کے ساتھ علم کی تربیت ہو رہی تھی، بڑے بڑے عالیشان قصر و ایوان میں بھی جو پانچویں صدی کے آغاز میں اس غرض سے تعمیر ہوئے، اس سے کچھ زیادہ نہ ہو سکی۔

ربطِ ماقبل:

اس سطور سے قبل شبلی نے لکھا ہے کہ ۱۴۵ تک تمام علوم کی تعلیم و تدریس میں حافظے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور علم کو ذہن در ذہن منتقل کر دیا جاتا تھا۔ نصاب میں حکماء

اور مفکرین کے اقوال و بیانات شامل تھے۔ لیکن اس کے علاوہ جن علوم کو ترقی حاصل ہوئی ان میں قواعد کا علم ضروری سمجھا جانے لگا۔ علم معانی یعنی الفاظ کے مفہوم کو سمجھنا علیحدہ مضمون قرار پایا۔ احکامِ شریعت کے علم نے علم فقہ کے نام سے جدا حیثیت حاصل کر لی۔ اقوالِ رسول اکرم ﷺ نے اپنی جگہ ایک جامع شعبہ علم کی حیثیت اختیار کر لی۔ تاریخ کا علم بھی متاثر ہوا۔ مختلف ذرائع سے پیش کی جانے والی احادیث رسول ﷺ کی صحت کو پرکھنے اور راویوں کے حافظے و نسیان اور سیرت و کردار کو جانچنے کا عمل اور ان احادیث کا معیار قائم کرنے کا تحقیقی علم بڑی اہمیت اختیار کر گیا۔ فلسفہ و منطق پر بے توجہی برتی گئی۔

پیشِ نظر سطور میں شبلی کہتے ہیں کہ سرکاری طور پر سرپرستی نہ ہونے کے باوجود مسلمانوں کی انفرادی کوششوں اور توجہ سے ہر اس جگہ علمی ترقی ہوئی جہاں مسلمان حکومتیں تھیں۔ شہر شہر، گاؤں گاؤں، گلی گلی، کوچہ کوچہ علم کا چرچہ تھا۔ عوام و خاص علم کے فروغ اور حصول میں دلچسپی لیتے تھے۔ ہزاروں چھوٹے بڑے مدرسے اور درسگاہیں قائم تھیں۔ ان درسگاہوں کو حکومتی سطح پر امداد و اعانت اور سرپرستی حاصل نہ ہونے کے باوجود ان میں علم کو فروغ حاصل ہوا اور تحصیلِ علم کا متوثر نظام قائم ہوا بیشمار لوگوں نے ان سے علمی پیاس بجھائی۔ ان سے علم حاصل کرنے والے، دورِ حاضر کے اداروں سے فارغ التحصیل طلبہ کے مقابلے میں زیادہ اہل اور بہتر عالم ٹھہرے، جنھوں نے دنیا کے میدان میں اپنا لوہا منوایا۔ بڑی بڑی عالیشان عمارتوں کی بجائے اس دور میں علمی مساجد کے صحن، اولیاء کی خانقاہیں اور علماء کے سیدھے سادھے آرائش و زیبائش سے بے نیاز ذاتی مکانات تھے۔ لیکن ان سادہ اور بے تکلف مکینوں سے علم کے وسیع و عریض دریا جاری ہوئے جن سے متعدد لوگوں کو علمی سیرابی ہوئی۔ سچ ہے کہ پانچویں صدی کے آغاز میں اس مقصد کے حصول کے لئے تعمیر ہونے والی عالیشان اور بلند و بالا عمارات، محلات اور درسگاہوں نے کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فروغ علم کے لئے عمارت کا بلند و بالا ہونا ہی کافی نہیں بلکہ طریقہ تدریس کے متوثر نظام کا بڑا دخل ہے۔

اقتباس ۵ : **اس دور میں جن علوم کو رواج حاصل ہوا وہ نحو، معانی، لغت، فقہ، اصول حدیث، تاریخ، اسماء الرجال، طبقات اور ان کے متعلقات تھے۔ عقلی علوم کا سرمایہ گو بہت کچھ جمع ہو گیا تھا مگر رواج عام نہ حاصل کر سکا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت نے اس کی اشاعت پر چنداں زور نہیں دیا اور عام ملک کو کچھ ناواقفیت، کچھ مذہبی غلط فہمی کی وجہ سے فلسفہ و منطق کے ساتھ ہمدردی نہ تھی۔**

تشریح :

علامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ اس دور میں یعنی ۱۴۵ھ کے بعد مسلمانوں میں جن علوم کو فروغ ہوا ان میں نحو، عربی قواعد، معانی، فصاحت و بلاغت کا علم، فقہ، شرعی مسائل کا علم، اسماء الرجال یعنی حدیث کے بیان کرنے والوں کی واقفیت کا علم، اصول حدیث، تاریخی علوم اور دینی علوم شامل تھے۔ اس عہد میں متعدد عقلی علوم بھی موجود تھے ان میں فلسفہ، منطق، معاشیات، سیاسیات وغیرہ شامل تھے مگر اس دور کے حکمرانوں نے عقلی علوم کو پھیلانے پر کوئی توجہ نہیں دی جس کی وجہ ان علوم کی اہمیت سے واقفیت نہ تھی اور یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ عقلی علوم مذہب کے مخالف ہیں خاص طور سے فلسفہ اور منطق کو مذہبی اعتبار سے برا سمجھا جاتا تھا۔

اقتباس ۶ : **تعلیم کا یہ دوسرا دور عجیب دلچسپیوں سے بھرا ہے۔ ڈیکھوٹیکس سے دریائے سندھ کے کنارے تک اسلام حکومت کر رہا ہے۔ حجازی فتوحات کا سیلاب اب رک چلا ہے۔ مفتوحہ ممالک میں امن و انتظام کا عمل ہوتا جاتا ہے۔ سیکڑوں قبیلے ریگستان عرب سے نکل کر دور دراز ملکوں میں آباد ہوتے جاتے ہیں۔ بہت سی نئی قومیں دلی ذوق سے اسلام کے حلقے میں داخل ہو رہی ہیں۔**

تشریح :

علامہ شبلی نعمانی اس اقتباس میں مسلمانوں کے دوسرے دور کا ذکر کرتے ہیں کہ دوسرے دور پر نظر ڈالنے سے تعجب اور حیرت ہوتی ہے۔ اسلام کی حدود پھیل رہی ہیں۔ دریائے ٹیکس (جو اسپین میں ہے) سے لے کر دریائے سندھ (قدیم ہندوستان) تک مسلمانوں کی افواج متعدد ممالک پر فتح حاصل کر چکی ہیں۔ اسلامی قوانین امن و امان کا سبب بن جاتے ہیں۔ سرزمین عرب کے بے شمار قبائل اپنے علاقوں سے نکل کر دور دراز مفتوحہ ممالک میں آباد ہو جاتے ہیں۔ مفتوحہ قومیں اسلام کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگتے ہیں۔

اقتباس ۷ : لیکن اب تک وسیع دنیا میں سلطنت کی طرف سے کوئی سر رشتہ تعلیم ہے نہ یونیورسٹیاں ہیں، نہ مدرسے ہیں۔ عرب کی نسلیں حکمران ہیں مگر حکومت ایسی بے تعلق اور اوپری ہے کہ ملک کے عام اخلاق، معاشرت، تمدن پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر چنداں نہیں پڑ سکتا۔ تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی ہے۔ ان سب باتوں پر دیکھو کہ علوم وفنون کس تیزی اور وسعت سے بڑھتے جاتے ہیں۔ مرد، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام، اندلس کا ایک ایک گاؤں علمی صداؤں سے گونج اٹھا ہے۔

تشریح :

علامہ شبلی نعمانی مسلمانوں کے قدیم طرز تعلیم کا جائزہ لیتے ہوئے یہ تحریر کرتے ہیں کہ اتنی عظیم الشان فتوحات کے باوجود مسلم حکومت کی طرف سے تعلیم کے سلسلے میں کوئی باقاعدہ محکمہ موجود نہیں ہے

نہ کوئی منصوبہ بندی ہے۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں بھی موجود نہیں ہیں۔ مسلمانوں پر عرب حکمرانی کر رہے ہیں مگر ان کی عملداری سرسری ہے۔ حکومت کے اچھے اثرات عوام الناس پر مرتب نہیں ہو رہے۔ عوام کے اخلاق، طرز زندگی اور تہذیب وتمدن پر فاتح اقوام کا ذرہ بھر بھی اثر قائم نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ بات قابل تعجب ہے کہ مختلف علوم وفنون اس دور میں تیزی سے ترقی کرتے ہوئے پھیل رہے ہیں۔ تمام علوم عربی زبان میں ہیں مگر عرب سے دور ایران، مصر، شام، اندلس، بغداد، نیشاپور، ہرات، وغیرہ کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی آوازوں سے گونج رہا ہے۔ یعنی علم وفن کو فروغ مل رہا ہے۔

اقتباس ۸ : اگرچہ متواتر انقلاب، تخت گاہوں کی بربادی، اسپین کی تباہی، تاتار کی عام غارت گری کے بعد ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا وہ ہزار میں ایک بھی نہیں۔ اور اس وجہ سے ہزاروں لاکھوں ناموروں کی صورتیں زمانے کی تاریخی نگاہ سے چھپ گئی ہیں۔ تاہم ہر عہد میں ہم سینکڑوں ماہرین و مجتہدین فن کا نشان دے سکتے ہیں۔ صرف ہم عصر ہم وطن اہل کمال کی فہرست تیار کی جائے تو بھی بہت سی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر اسپرنگر (Sprenger) صاحب تخمینہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا حال مل سکتا ہے۔ اب اگر یہ قیاس لگایا جائے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں نسبت سے ایک صاحب کمال پیدا ہوتا ہے تو عام تعلیم کا ایک معقول اندازہ ہو سکتا ہے۔

تشریح :

اس نثر پارے میں علامہ شبلی نعمانی یہ اظہار خیال کرتے ہیں کہ یکے بعد دیگرے آنے والے انقلابات یعنی بڑی بڑی سلطنتوں کی تباہی، اسپین میں مسلمانوں کی بربادی، بغداد میں تاتاریوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا ذلت اٹھانا اور بے پناہ ہلاکت وتباہی کے باوجود مسلمانوں کے پاس جو کچھ بھی باقی بچا وہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے۔ ان ہی تباہی و بربادی کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں نامی گرامی مسلمانوں کی کاوشیں، تخلیقات اور ایجادات زمانے کی نگاہوں سے چھپ گئی ہیں۔ اس کے باوجود ہم مسلمانوں کے ہر عہد میں موجود ماہر فنون اور علماء واساتذہ کا ذکر کر سکتے ہیں۔ صرف ایک ہی زمانے کے ایک ہی وطن کے اہل ہنر اور اہل علم کی فہرست تیار کی جائے تو کئی کئی جلدیں یعنی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں، مشہور انگریز مؤرخ ڈاکٹر اسپرنگر حساب لگا کر یہ تحریر کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے اسماء الرجال (یعنی حدیث مرتب کرنے والے لوگوں کی معلومات کا علم) میں تقریباً پانچ لاکھ سے زائد مشہور عالموں کے حالات کا پتہ چل سکتا ہے۔ اب اگر صرف اندازہ لگایا جائے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کے گروپ میں سے کسی تعلق سے ایک صاحب ہنر وکمال سامنے آسکتا ہے تو اس زمانے کی عام تعلیم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اقتباس ۹ : مشہور علماء کے تعلیمی حالات پڑھو۔ ایک ایک استاد کے حلقۂ درس میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں طالب علم مشغول درس نظر آئیں گے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس زمانے کے بعض حلقۂ درس ایسے ہوتے تھے جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تھیں اور لوگ احادیث نبوی لکھتے تھے۔ اس بڑے مجموعے میں دو سو امام حاضر ہوتے تھے جو اجتہاد اور فتویٰ دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے۔

تشریح :

علامہ شبلی نعمانی مزید تحریر فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے مشہور علماء کے تعلیمی حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ سامنے آتا ہے کہ ایک ایک استاد کے حلقہ درس یعنی کلاس میں ہزاروں کی تعداد میں علم کے حاصل کرنے والے سیکھنے اور سمجھنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ مشہور عالم دین علامہ ذہبی تحریر فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے بعض اساتذہ

کے حلقہ درس یعنی کلاس میں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دس ہزار سے زائد سیاہی کی دواتیں رکھی جاتی تھیں جن کو استعمال کر کے طالبعلم لکھا کرتے تھے۔ زیادہ تر احادیث نبوی ﷺ تحریر کی جاتی تھیں۔ ایسی بڑی بڑی جماعتوں میں تقریباً دو سو سے زائد امام حاضر ہوتے تھے جو اجتہاد کرنے اور فتویٰ دینے کی پوری پوری اہلیت اور صلاحیت رکھتے تھے۔

اقتباس ۱۰ : اس دور میں تعلیم کا مستند طریقہ وہی تھا جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے یعنی ''املاء'' جس کو اردو میں لیکچر دینا کہتے ہیں۔ استاد ایک بلند مقام مثلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا۔ طالبعلم جو ہمیشہ قلم دوات لے کر بیٹھتے تھے، ان تحقیقات کو استاد خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے اور اس طرح ہر ایک کی مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی اور ''اَمالی'' کے نام سے مشہور ہوتی تھی۔

تشریح :

علامہ شبلی نعمانی اس نثر پارے میں ''مسلمانوں کا قدیم طرز تعلیم'' کی جھلک دکھاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے قدیم دور میں تعلیم کا مستند اور تسلیم کیا ہوا طریقہ وہی تھا جو آج ترقی یافتہ ملکوں میں رائج ہے یعنی ''املا'' کا طریقہ جس کو اردو میں لیکچر کا طریقہ کہتے ہیں یعنی استاد کمرے یا کلاس کی اونچی جگہ پر منبر یا کرسی پر بیٹھ جاتا تھا۔ اور کسی ایک موضوع، یا فن کے بارے میں سمجھانا اور سکھانا شروع کرتا۔ طالبعلم جو ہمیشہ قلم اور سیاہی کی دوات ساتھ لے کر بیٹھتے تھے ان ارشادات کو استاد کے خاص لفظوں میں ہی لکھتے جاتے تھے۔ اس طرح کئی لیکچر کے بعد ہر طالبعلم کے پاس ایک ہمیشہ موجود رہنے والی کتاب تیار ہو جاتی تھی جو ''امالی'' کے نام سے مشہور ہو جاتی تھی۔ یہ کتاب طالبعلم اور دیگر طلبہ کی ضرورت کے وقت کام آجاتی تھی۔

اقتباس ۱۱ : دوسری چیز جو اعلیٰ تعلیم کے لیئے گویا لازمی تھی مناظرہ کی مجلسوں میں شریک ہونا تھا۔ مشہور شہروں میں بحث و مناظرے کے لیئے خاص وقت اور مقام مقرر تھے، بعض امراء اس قسم کی مجلسیں اپنے مکانوں پر منعقد کرتے تھے۔ فقہ، ادب، نحو وغیرہ ہر علم کے لیئے جداگانہ مجلسیں تھیں۔ ان میں علماء اور طلباء دونوں شریک ہوتے تھے اور کوئی ممتاز عالم بحث کے تصفیے کے لیئے انتخاب کیا جاتا تھا۔ یہ جلسے جن میں زیادہ تر حق پسندی اور انصاف کا استعمال ہوتا تھا، معمولی نصاب تعلیم ختم کرنے کی بہ نسبت بہت زیادہ مفید اور پر اثر تھے۔ تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد استاد ایک تحریری سند عطا کرتا تھا جس میں اس کی تعلیم کی ایک اجمالی کیفیت اور درس دینے کی اجازت لکھی ہوتی تھی۔ اس سند میں وہ طیلسان پہنے کی بھی اجازت دیتا تھا جو علماء کا مخصوص لباس ہوتا تھا۔

تشریح :

علامہ شبلی نعمانی مسلمانوں کے قدیم طرز تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ''مناظرہ'' میں حصہ لینا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مناظرہ یعنی کسی مسئلے پر بحث و مباحثہ کرنا اور اس کے ذریعے سیکھنا۔ مناظرے کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، جن میں شرکت کرنا ہر طالبعلم کے لیئے لازمی تھا۔ مناظرے کے لیئے خاص مقام اور وقت مقرر کیا جاتا تھا۔ بعض حکومتی عہدیدار اور امراء اس مقصد کے لیئے اپنے مکانوں میں محفلیں منعقد کرتے تھے۔ فقہ، ادب، نحو غرض کہ ہر قسم کے علوم کے لیئے مناظرے کی مجالس منعقد کی جاتی تھیں۔ ان میں ماہر علماء اور طلبہ دونوں شریک ہوئے۔ بحث کے آخر میں مشہور عالمِ دین اس علمی بحث کا نتیجہ اور حاصل بیان کرتے۔ ان جلسوں میں انصاف اور سچائی کی تعلیم کو فروغ دیا جاتا تھا۔ اس زمانے کا معمولی نصاب بھی بہت زیادہ فائدہ مند اور کارآمد ہوتا تھا۔ علم کی تکمیل کے بعد کامیاب طلبہ کو تحریری اسناد عطا کی جاتی تھیں اس میں طالب علم کی کارکردگی کی تفصیل اور درس و تدریس کی اجازت بھی درج ہوتی تھی۔ سند ایک محفل میں دی جاتی۔ ہر طالب علم کے لیئے وہ مخصوص لباس پہننے کی اجازت تھی جن کو آج کل گاؤن یا عبا کہا جاتا ہے جو اساتذہ کرام اور علماء کرام پہنتے تھے۔

اقتباس ۱۲ : کثیر الاشغال وقت میں بھی بوعلی سینا کی خدمت میں مستعد طلبہ کا ایک گروہ حاضر تھا۔ (۳) تعلیم میں نہایت آزادی تھی۔ کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ جو شخص جس خاص فن کو چاہتا تھا حاصل کر سکتا تھا۔ اہل کمال کے زمرے میں سیکڑوں گزرے ہیں جو ایک فن میں امام تھے اور دوسرے فنون میں معمولی طالب العلم کا بھی درجہ نہیں رکھتے تھے۔ (۴) امراء در اہل منصب کا گروہ جو شائقین علم کی سرپرستی کرتا تھا عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا۔ تعلیم کی اشاعت کا یہ بہت بڑا سبب تھا۔

تشریح :

علامہ شبلی نعمانی قدیم دور میں تعلیم کی اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کئی کئی کاموں میں مصروفیت کے باوجود مشہور عالم "بوعلی سینا" کے سامنے تازہ دم طالبعلم بڑی تعداد میں حاضر رہا کرتے تھے، یہی حال مشہور علماء واساتذہ کا تھا، تیسری اہم بات یہ تھی کہ امراء اور حکومتی عہدہ داروں کی اکثریت طالبعلموں کی سرپرستی کرتے تھے۔ یہ خود بھی تعلیم یافتہ اور علوم میں ماہر ہوتے تھے۔ یہی اس زمانے کی تعلیم کی اشاعت وفروغ کا اہم سبب تھا۔

اقتباس ۱۳ : سلاطین وزراء تو ایک طرف معمولی رئیس کی خدمت میں سیکڑوں ادیب وفاضل موجود ہوتے تھے اور چونکہ ان کی تنخواہیں کسی خدمت کے بدل نہ تھیں بلکہ صرف ان کا ذاتی کمال اور قبول عام مہنگے داموں کو خرید اجاتا تھا، تمام ملک میں لیاقت اور شہرت پیدا کرنے کا ایک عام جوش پھیل گیا تھا۔ تصنیفات میں زورطبع کے ساتھ تحقیق واحتیاط کا لحاظ اس لیے زیادہ تر کرنا پڑتا تھا کہ جن قدردانوں کے سامنے پیش کرنا ہے وہ خود صاحب النظر اور نکتہ چیں ہیں۔

تشریح :

اس پیراگراف میں علامہ شبلی نعمانی قدیم طرز تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں کہ معمولی امیر آدمی کے پاس بھی کافی تعداد میں ادیب اور فاضل حضرات موجود ہوتے تھے اور ان کو جو معاوضہ دیا جاتا تھا وہ کسی کام یا صلے کے نتیجے میں نہیں دیا جاتا بلکہ ان کے ذاتی ہنر اور علم کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ماہر علماء اور اساتذہ کو مہنگے مہنگے معاوضے دے کر حاصل کیا جاتا تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ مملکت میں علمی میدان میں عزت اور شہرت حاصل کرنے کا شوق پھیل چکا تھا۔ کتابوں کو لکھنے اور مرتب کرنے میں بھی بڑی احتیاط کی جاتی تھی۔ بڑی چھان بین اور تحقیق کے بعد کتابوں کا مواد مرتب کیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ نصاب بڑے بڑے علماء اور اساتذہ اور قابل قدر لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی تھیں جو خود متعدد علوم میں وسیع مطالعہ رکھتے تھے اور معمولی غلطیوں کو بھی فوراً پکڑ لیتے تھے۔

جدید سائنس اور عصری تقاضے

حوالہ سبق:

پیشِ نظر عبارت مضمون "جدید سائنس اور عصری تقاضے" سے ماخوذ ہے

حوالہ مصنف:

اس سبق کے مصنف "ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن" ہیں۔

اقتباس ۱: سائنس علم کی اس شاخ کا نام ہے جس نے تجربہ خانے میں جنم لیا اور تجربہ خانے میں ہی نشوونما پاتی ہے۔ اس لئے اسے تجرباتی علم کہا جاتا ہے۔ سائنس کا موضوع دنیا کی مادّی چیزیں ہیں۔ حیوانات پودے کیمیائی عناصر سورج چاند ستارے پانی اور خشکی یا پھر ایسی چیزیں جو مادی چیزوں سے وجود میں آئی ہوں۔ مثلاً حرارت روشنی آواز مقناطیسیت وغیرہ۔

اقتباس کی تشریح:

ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن سائنس کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ سائنس علم کی ایسی شاخ ہے۔ جو تجربہ خانوں میں پیدا ہوئی۔ اور تجربات ہی سے پروان چڑھی۔ سائنس علم کو تجربات کے ذریعے ہی ثابت کیا جاتا ہے، اسی لئے سائنس کو ایسا علم قرار دیا جاتا ہے۔ جس میں تجربات کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ سائنس کائنات کی مادی چیزوں کو اپنے مطالعے کا موضوع بناتی ہے، ان میں تمام قسم کے جانور، نباتات، کیمیائی عناصر، سورج، چاند، ستارے، پانی اور زمین۔ ان کے علاوہ ایسی چیزیں بھی شامل ہیں۔ جو مادی چیزوں سے وجود میں آتی ہیں، ان میں حرارت، روشنی، آواز اور مقناطیس وغیرہ شامل ہیں۔

اقتباس ۲: پھر جب مسلمان کا زمانہ آیا تو انہوں نے مادی چیزوں میں تحقیق اور دریافت کے لئے تجرباتی طریقے کو اپنایا اور سائنس کے لئے یہ اصول بنالیا کہ اسے تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ وہ تجربہ ہمہ تن شوق کے کیا کرتے تھے۔ اس کے لئے وہ باقاعدہ تجربہ خانے بناتے تھے۔ تجربہ سے جو نتائج حاصل ہوتے انہیں قلمبند کرتے اور پھر کتابیں لکھتے۔

یہی صحیح سائنسی طریقہ کار ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سائنس انسان کے لئے کارآمد بن گئی۔ مثلاً طب میں تجربات کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ بہت سی بیماریوں کا علاج دریافت ہوگیا۔

کیمیا میں فائدہ مند مرکبات ایجاد ہوئے۔ فلکیات میں ستاروں کی گردش کے اصول معلوم ہوئے۔ اس سے رات میں سفر کرنے کے لئے سمت کے یقین میں آسانی پیدا ہوئی۔ ایسے مسلمان سائنس دانوں میں سے آج بھی بہت سے لوگوں کے نام زندہ ہیں۔

اقتباس کی تشریح:

اس کے بعد مسلمانوں کا دور آیا تو انہوں نے مادی چیزوں میں تحقیق جستجو اور دریافت کے لئے تجربات کو اپنانا شروع کیا اور خاص طور سے سائنس کے لئے یہ اصول بنایا گیا کہ اسے تجربات کے ذریعے ہی پرکھا جائے گا۔ اسلئے وہ تجربات کو بڑے توجہ اور دلچسپی سے انجام دیتے۔ اس عمل کے لئے باقاعدہ تجربہ گاہیں بنائی جانے لگیں۔ تجربات کے نتائج حاصل ہوتے جو لکھ کر کتابوں کی صورت میں محفوظ کر دیا کرتے تھے۔ یہ صحیح سائنسی طریقہ ہے۔ اس طرح کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ سائنسی انسانوں کے لئے فائدہ پہنچانے والا علم بن گیا، مثلاً طب میں تجربات کرنے کا یہ فائدہ ہوا کہ بہت سی بیماریوں کا علاج دریافت ہوا۔ کیمیاء میں فائدہ مند مرکبات سامنے آنے لگے، فلکیات میں تجربات کے بعد ستاروں کی گردش کے اصولوں کا علم ہوا جو رات کو سفر کرنے والے مسافروں کی راستے میں رہنمائی میں کام آیا۔ ایسے مسلمان سائنسدانوں میں سے آج بھی بہت سے لوگوں کے نام زندہ ہیں۔

اقتباس ۳: مسلمانوں نے کچھ کم نہیں، چھ صدیوں تک سائنس کی خدمت کی۔ اس پر لاکھوں کتابیں لکھیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں دنیا کے مختلف ملکوں کی لائبریریوں میں آج بھی موجود ہیں۔ اس پورے عرصے میں یورپ پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اسی لئے اسے یورپ کا تاریک دور کہا جاتا ہے۔ دنیا کے دوسرے علاقوں کی بھی تقریباً ایسی ہی کیفیت تھی۔ یورپ نے سائنس کا ترکہ مسلمانوں سے ہی حاصل کیا۔ یورپی طلبہ قریبی مسلم ملک اسپین جاتے۔ وہاں مسلمانوں سے سائنس سیکھتے اور پھر خود اپنے وطن واپس آکر اسے آگے بڑھاتے۔ ان لوگوں نے مسلمانوں سائنس دانوں کی کتابوں کے یورپی زبانوں میں بڑے پیمانے پر ترجمے بھی کرائے۔ یہ کام اتنا بڑا بھی تھا کہ تین صدیوں میں بھی مکمل نہیں ہوا۔

اقتباس کی تشریح:

مسلمانوں نے کم از کم چھ سال تک سائنس کی خدمت انجام دی۔ سائنس کے موضوعات پر لاکھوں کتابیں تحریر کیں۔ جس میں سے ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں آج بھی دُنیا کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ جبکہ اہل یورپ جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے، اسی لیئے اس زمانے کو اہل یورپ کا سیاہ دور کہا جاتا ہے دیگر علاقوں میں بھی تاریکی کی کیفیت تھی۔ یورپ نے سائنس کی میراث مسلمانوں سے ہی حاصل کی۔ یورپ کے طالبعلم اپنے قریبی مسلم ملک اسپین جاتے وہاں مسلمانوں سے سائنسی علوم حاصل کرتے پھر خود اپنے وطن واپس جا کر اسی پر کام کرتے اور تجربات کو آگے بڑھاتے۔ اہل یورپ نے مسلمان سائنس دانوں کی کتابوں کو جو عربی زبان میں ہوتی تھیں، ان کے ترجمے اپنی زبانوں میں کرائے۔ یہ کام اہلِ یورپ کے لیئے اتنا بڑا تھا کہ تین سو سال میں بھی مکمل نہ ہوا۔

اقتباس ۴: سائنس کی تمام ایجادات اور کامیابیوں میں سے اس کی دو ایجادات سب سے اہم اور سب سے زیادہ ہمہ جہت ہیں۔ کیونکہ ان ہی پر سائنس کی تمام ترقیوں کا دارومدار ہے۔ اس میں سے ایک ایجاد پہیے کی ہے اور دوسری بجلی کی۔ ان دونوں ایجادات کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اگرچہ یہ دونوں، چشم تصور میں، واپس لے لی جائیں تو سائنس کی تمام ترقیاں یکلخت رک جائیں اور انسانی معاشرہ صدیوں پیچھے چلا جائے۔

اقتباس کی تشریح:

سائنس کی بے شمار کامیاب ایجادوں میں سے دو ایجادات کو سب سے اہم سمجھا جاتا ہے، جس کے فائدہ مند اثرات ہر طرف نظر آرہے ہیں، ان میں ایک ایجاد ''پہیہ'' کی دوسری ایجاد ''بجلی'' کی ہے، ان دونوں ایجادات کی وجہ سے سائنس کی ترقی انحصار کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ کیوں کہ اگر ان دونوں ایجادات کو آنکھیں بند کر کے واپس لے لیا جائے تو سائنس کی تمام ترقیاں ایک دم رک جائیں گی اور انسانوں کا معاشرہ کئی سو سال پیچھے ماضی میں چلا جائے گا۔

اقتباس ۶: بہر کیف اس قسم کی ایجادات اور فائدہ رسانیوں کی وجہ سے سائنس جو کبھی ایک شوقیہ علم ہوا کرتی تھی اب انسان کی ضرورت بن چکی ہے اس نے انسان کے لئے زندگی آرام دہ اور فرحت بخش بنادی ہے۔ بیماروں کے لئے یہ آبِ شفا ہے۔ کسانوں کے لئے یہ خوشحالی کی کلید ہے۔ اہلِ صنعت کے لئے یہ جادو کی چھڑی ہے۔ کاروبارِ حیات کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لئے یہ قوت توانائی کا سب سے بڑا منبع ہے اور دنیا میں انسان کی روز افزاں آبادی کی کفالت کی ضمانت ہے۔

ربطِ ماقبل:

ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے ان سطور سے قبل اپنے مظمون سائنس کے ارتقاء کہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ سائنس کے طفیل انسان نے حیرت انگیز ایجاد کی ہیں۔ جنھوں نے انسانی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ دیگر ایجادات کے علاوہ دو ایجادات یعنی پہیہ اور بجلی ایسی ایجادات ہیں جن کو ترقی کی اساس اور روح قرار دیا جاسکتا ہے۔

تشریح:

پیشِ نظر اقتباس میں مصنف کہتا ہے کہ سائنس جو کبھی شوقیہ علم کا درجہ رکھتی تھی اب انسان کی ضرورت ہے، اس کی حاجات اور معاشرے کی ترقی اور اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے طفیل انسان کی زندگی آسائشوں، سکون اور راحت و طمانیت سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ زندگی کی رنگینیاں اسی کی دین ہیں۔ اسی علم کی ترقی کی وجہ سے ہم لاعلاج بیماریوں سے چھٹکارہ پانے کے قابل ہوئے اور وہ امراض جنھیں موت کا پیغام سمجھا جاتا تھا ان سے نجات مل گئی۔ علومِ سائنس کی وجہ ہی سے زرعی انقلاب برپا ہوا۔ وسیع و عریض زرخیز زمین جو کسانوں اور دہقانوں کی شب و روز محنت اور بے حد خون پسینہ بہانے پر کچھ اناج پیدا کرتی تھی آج سائنسی ترقی و تحقیق و طفیل ایجاد ہونے والے آلات و زراعت اور تحقیقی نتائج کی بدولت تین گنا زیادہ اناج اگلنے لگیں۔ جس سے کسان خوشحال ہو گئے اور ان کو ان کی محنتوں سے زیادہ ثمرات ملنے لگیں۔

اسی طرح صنعت کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی ہوئی۔ صنعت کاروں کی چاندی بن گئی۔ دنوں کا کام گھنٹوں میں کیا جانے لگا۔ سائنسی ایجادات الہٰ دین کا چراغ ثابت ہونے لگیں۔ جنھوں نے انسانی معاشرے کو ترقی کے بلند ترین مقام پر پہنچادیا۔ غرض یہ کہ سائنسی ترقی نے انسانی زندگی بدل کر رکھ دیا۔ وہ اس قدر تیز رفتار ہوگئی جتنی کبھی نہ تھی۔ انسانی آبادی میں روز بروز اضافے نے جو مسائل کھڑے کئے تھے سائنس نے اس کا حل اور وسائل تک پہنچادیئے اس طرح سائنس انسان کے لئے رحمت ثابت ہوئی جس کے زیرِ سایہ اسے ترقی اور تحفظ نصیب ہوا۔

اقتباس ۷: پھر بھی آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہی سائنس کی ترقی کی آخری حد ہے۔ اس کی آخری حد اس سے بہت آگے کہیں پر ہے۔ انسان اسے تصور میں بھی نہیں لاسکتا۔ ہاں! جو کچھ اس وقت مستقبل قریب کے امکانات میں نظر آرہا ہے، وہ یہ ہے کہ عنقریب، شاید اگلی ہی صدی میں، سائنس کے ذریعے ہمیں مزید ایسے ایسے فائدے حاصل ہوں گے کہ اب تک کے فائدے اس کے آگے حقیر نظر آئیں گے۔ اب تک کی ترقیوں نے تو انسان کے لوازمِ زندگی کو تبدیل کیا ہے، سائنس کی اگلی ترقیاں عجب نہیں کہ خود انسان کو تبدیل کردیں ورنہ دوسری مخلوقات کو تو ضرور ہی تبدیل کردیں گی۔ ایسا انقلاب حیاتیات (بائلوجی) کے ذریعے آئے گا۔ انسان حیاتیات کی مدد سے پودوں یا حیوانات کے تخم کو ہی تبدیل کردے گا اور پھر اپنی پسند کے حیوانات یا پودے پیدا کرنے لگے گا، زیادہ پیداوار دینے والے پھل دار درخت اور زیادہ اناج پیدا کرنے لگے گا، زیادہ پیداوار دینے والے پھلدار درخت اور زیادہ اناج پیدا کرنے والی فصلیں، زیادہ گوشت اور دودھ دینے والے مویشی، جراثیم سے پاک پودے اور حیوانات اور اعلیٰ ہذا القیاس دیگر دریافتیں۔

سائنس کی یہ نئی صنعت جینیٹک انجینئرنگ (Genetic Engineering) کہلاتی ہے اور وہ اس انقلاب کا بڑے زور وشور سے بگل بجا رہی ہے۔

اقتباس کی تشریح:

اس کے باوجود اس کو سائنس کی ترقی کی آخری حد سمجھنا چاہیے۔ آخری حد کے بارے میں انسان تصور نہیں کرسکتا کہ سائنس کی آخری حد کہاں ہے؟ البتہ اس وقت کے حالات اور ترقیوں کا اندازہ لگا کر مستقبل کے بارے میں یہ نظر آ رہا ہے کہ اگلی صدی میں سائنس کے ذریعے انسان کی زندگی کی چیزوں کو تبدیل کیا ہے، سائنس کی اگلی ترقیاں تو خود انسان کو ہی تبدیل کردیں گی اور دوسری مخلوقات کو بھی بدل ڈالیں گی۔ یہ انقلاب سائنس کی ایک شاخ حیاتیات کے ذریعے آئے گا۔ انسان علم حیاتیات کی مدد سے پودوں اور حیوانات کے پیدائشی بیجوں کو تبدیل کردے گا اور اپنی پسند کے حیوانات اور پودے پیدا کرنے لگے گا۔ زیادہ پیداوار دینے والے پھل دار درخت اور زیادہ اناج پیدا کرنے والی فصلیں، زیادہ گوشت اور دودھ دینے والے مویشی، جراثیم اور بیماریوں سے پاک پودے اور حیوانات، غرض کہ اس قسم کی دریافتیں اور ایجادات سامنے آنے لگی ہیں۔ سائنس کی نئی صنعت جینیٹک انجینئرنگ کہلاتی ہے اور یہ صنعت مستقبل کے بڑے انقلاب کا زور شور سے پتہ دے رہی ہے۔

اقتباس ۸: ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ سائنس ہمارا ہی ترکہ ہے۔ ہم ہی اسے تجرباتی علم بنایا اور ہم نے کچھ کم نہیں، چھ صدیوں تک پروان چڑھایا ہے۔ اس لیئے سائنس سے ہمارا تاریخی رشتہ ہے۔ ہمیں یہ بات بھی جان لینی چاہیئے کہ سائنس کی تعلیم سے اعتقادی فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیئے بھی مسلمان کو سائنس ضرور پڑھنی چاہیئے۔ اس سے ایمان کی تازگی اور تقویت حاصل ہوتی ہے۔ سائنس اسلام کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کرتی ہے۔ مثلاً شکم مادر میں نشوونما پانے والے بچے کے جن جن مدارج کو سائنس نے دریافت کیا ہے وہ وہ بعینہ وہی ہیں جو قرآن مجید میں بیان ہو چکے ہیں۔ سائنسی تحقیق کی قرآن مجید کے ساتھ ایسی زبردست مطابقت دیکھ کر فرانس کا ایک مشہور ڈاکٹر مورس بوکائے (Maurice Bucaille) حیران رہ گیا اور چند برس ہوئے کہ وہ مسلمان ہو گیا۔

اقتباس کی تشریح:

یہ بات ہمیں بھولنی نہیں چاہیئے کہ سائنس ہماری میراث ہے۔ مسلمانوں نے ہی سائنس کو تجرباتی علم بنایا اور کچھ نہیں تو چھ سالوں تک اس کی ترقی کے لیئے کام کیا۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کا سائنس سے تاریخی رشتہ بہت مضبوط ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ سائنسی تعلیم سے مذہبی اور اعتقادی فائدے بھی حاصل ہوتے رہیں اس لیئے بھی ہر مسلمان کو سائنس کی تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیئے۔ اس سے ایمان کو تازگی اور توانائی حاصل ہوتی ہے۔ سائنس اسلام کی باتوں کی تصدیق کرتی ہے اسلامی سچائیوں کا اعتراف کرتی ہے مثال کے طور پر ماں کے پیٹ میں نشوونما پانے والے بچے کے بارے میں جن مدارج کا ذکر سائنس نے کیا ہے وہ سو فیصد وہی مدارج ہیں جن کا ذکر ۱۴۰۰ سو سال پہلے قرآن شریف میں موجود تھا سائنس نے ان کی تصدیق کی۔ سائنسی تحقیق اور قرآن کی سچائیوں میں مماثلت دیکھ کر فرانس کا ڈاکٹر مورس بوکائے حیران رہ گیا اور چند برس ہوئے کہ وہ مسلمان بھی ہو گیا۔ دوسرے سائنس دان بھی اللہ کے وجود اور اسکی وحدانیت کے قائل ہو رہے ہیں کیونکہ سائنس سے بھی ثابت ہو رہا ہے کہ یہ کائنات خدائے واحد کی پیدا کردہ ہے۔

بردبار اور دانشمند

حوالہ سبق: یہ پیراگراف اردو کی کتاب کے سبق "بردبار اور دانش مند" سے لیا گیا ہے۔

حوالہ مصنف: اس سبق کے مصنف کا نام "ڈاکٹر شفیق الرحمٰن" ہے۔

اقتباس ۱: دن بھر الو آرام کرتا ہے اور رات بھر "ہو ہو" کرتا ہے۔ اس میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے؟...... میرا قیاس اتنا ہی صحیح ہو سکتا ہے جتنا کہ آپ کا......! لوگوں کا خیال ہے کہ الو تو ہی تو کا وظیفہ پڑھتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو وہ ان خود پسندوں سے ہزار درجہ بہتر ہے جو ہر وقت "میں ہی میں" کا ورد کرتے رہتے ہیں۔

اقتباس کی تشریح:

''الّو'' کی خاصیت یہ ہے کہ یہ دن بھر سوتا رہتا ہے اور رات بھر جاگتا ہے اور ''ہُو ہُو'' کی آوزیں نکالتا ہے۔ ''الّو'' کے اس عمل میں کیا حکمت پوشیدہ ہے مجھے بھی اتنا ہی معلوم ہے جتنا دوسروں کو پتا ہے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ''الّو'' رات کو ''تُو ہی تُو'' کا ورد کرتا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو وہ ان مطلبی اور خود غرض لوگوں سے زیادہ بہتر ہے جو ہر وقت ''میں ہی میں'' کا وظیفہ پڑھتے رہتے ہیں۔

اقتباس ۲: اُلّو دوسرے پرندوں سے میل جول کو اچھا نہیں سمجھتا وہ اپنا وقت اور زیادہ اُلّو بننے میں صرف کرتا ہے ''آپ کام کاج سوہا کاج''...... اُلّو کا مقولہ ہے۔ اُلّو کا محبوب مشغلہ رات بھر بھیانک آوازیں نکال کر پبلک کو ڈرانا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ پبلک کیا چاہتی ہے۔ ہمارے ملک کی مثالی توہم پرستی میں اُلّو نے قابلِ تقلید حصّہ لیا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی ناکامیوں کا سبب اس غریب اُلّو کو بتاتے ہیں جو مکان کے پچھواڑے درخت پر رہتا ہے اُلّو کب نحوست ہوتی ہے پر اتنی نہیں۔ اُلّو اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ جو دور جنگلوں میں رہتے ہیں۔ اُلّو کو بُرا بھلا کہتے وقت یہ مت بھولیئے کہ انہوں نے اُلّو بننے کی التجا تھوڑا ہی کی تھی۔

اقتباس کی تشریح:

''الّو'' اکثر انسانوں کی طرح دوسرے پرندوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتا وہ زیادہ وقت اُلّو بننے میں گزار دیتا ہے۔ اپنے کام سے مطلب رکھتا ہے۔ یہ شاید اسی کا مقولہ ہے ''آپ کام کاج سوہا کاج''۔ اُلّو کا پسندیدہ کام ایسی آوازیں نکالنا ہے جسے سن کر لوگ ڈرنے لگتے ہیں۔ اُلّو شاید یہ جانتا ہے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ اس ملک میں لوگ اکثر وہم میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کو مختلف وہموں میں مبتلا رکھنے میں اُلّوؤں کا کردار سب سے نمایاں ہے۔ بہت سے لوگ اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار اس غریب ''الّو'' کو قرار دیتے ہیں۔ جوان کے مکان کے پچھلے حصے کے درختوں پر بسیرا کیئے ہوئے ہے۔ ٹھیک ہے ''اُلّو'' منحوس ہوتا ہے مگر اب اتنا بھی منحوس نہیں ہے۔ اُلّو اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ دور جنگلوں میں رہنے والے اُلّو اچھے ہوتے ہیں۔ جو لوگ اُلّوؤں کو بُرا کہتے ہیں انہیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ انہوں نے اللہ سے ''اُلّو'' بننے کی دعا نہیں مانگی تھی۔

خطوطِ غالب

نامہ نگار: مرزا اسد اللہ خان غالب مکتوب الیہ: میر مہدی مجروح

حوالہ:

یہ عبارت ''مرزا اسد اللہ خان غالب'' کے خط بنام ''مہدی مجروح'' کی ابتدائی سطور ہیں۔ جس میں میر صاحب سے مخاطب۔

تعارف نامہ نگار:

مرزا غالب عظیم شاعر، مخصوص، منفرد اور جدید خطوط نگاری کے موجد تھے۔ خطوط میں بے تکلفی، سادگی، اختصار و جامعیت، جزئیات نگاری، نکتہ نگاری، نکتہ آفرینی اور مزاح وظرافت کو اپنانے، مختلف اسالیب بیان مہارت سے کھپانے، انھیں اپنی سوانح حیات اور اپنے زمانے کی تاریخ بتانے والے، وہ منفرد دانش ور ہیں۔ جن کے خطوط، اردو نثر میں نیا تجربہ اور نقشِ اول ثابت ہوئے۔ انھوں نے اپنے اس موقف کو سچ کر دکھایا کہ، ان کی خطوط نگاری شاعری کی طرح ان کے دعوی کی سچائی پیش کرتی ہے کہ:

ادائے خاص سے غالب ہوا نکتہ سرا
صدائے عام ہیں یارانِ نکتہ داں کے لیئے

تعارفِ مکتوب الیہ:

میر مہدی مجروح میر حسن کے بیٹے اور غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں سے ہیں۔ غدر دہلی میں، دلّی چھوڑ کر پانی پت چلے گئے پھر بسلسلہ ملازمت منتقل ہو گئے۔ آخری زمانے میں نواب حامد علی خان والیءِ رامپور نے سرپرستی کی۔ آپ ایک عمدہ مرثیہ گو تھے۔ سرفراز حسین ان کے بھائی تھے۔ جن کا نام ہماری نصابی کتاب میں بطور مکتوب الیہ غلطی سے شائع کر دیا گیا ہے۔

اقتباس ا: **تمہارے خط کے آنے سے وہ خوشی ہوئی، جو کسی دوست کے دیکھنے سے ہو۔ لیکن زمانہ وہ آیا ہے کہ ہماری قسمت میں خوشی ہے ہی نہیں۔ خط سے معلوم ہوا تو کیا معلوم کہ ڈھائی سو دیے۔ ان دنوں ڈھائی روپے بھی بھاری تھے۔ ڈھائی سو کیسے ہیں، سبحان اللہ۔ باوجود اس تہی دستی کے پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ روپے گئے بلا آبرو بچی۔**

تشریح:

پیش نظر سطور میں میر صاحب سے مخاطب ہیں۔ عزیز "تمھارا خط ملا" بے حد مسرت ہوئی غالب خوشی کا ظہار انتہائی جذباتی انداز میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خط ملنے سے ایسی مسرت ہوئی جیسے کسی دوست سے ملنے میں ہوئی۔

یہ احساسات غالب کے میر مہدی سے قلبی تعلق اور گہری محبت و الفت کی دلیل ہیں۔ غالب اظہارِ مسرت کے ساتھ یک دم اظہارِ افسوس کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ہماری قسمت میں خوشی کہاں؟ غم اور مصیبت و پریشانی جن سے ہمارا پرانا یارانہ ہے گو کہ یہ گوارا نہیں کہ ہم خوش رہ سکیں۔ کیونکہ گرد و پیش کا ماحول غم آلود ہے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، شہر کے حالات بہت مخدوش اور دکھی ہیں کیونکہ غدر کی ناکامی کے باعث ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ انگریز ظلم و ستم ڈھانے پر تلا ہوا ہے۔ کوئی گھر اور خاندان ایسا نہیں جو ستم رسیدہ نہ ہو۔ بقول حالی

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھا نہ سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانہ ہرگز

ان حالات میں دل کو رنجیدہ اور ملول کر دیا ہے۔ ہر خوشی کافور ہوگئی ہے۔ بدقسمتی نے آگھیرا ہے۔ خدا کسی قوم کو عروج کے بعد زوال یا حکمرانی کے بعد محکومی سے ہمکنار نہ کرے۔ آپ کے خط سے پتہ چلا کہ سرفراز حسین کو ڈھائی سو روپے جرمانے کی ادائیگی کے بعد انگریزوں کے ظلم و ستم سے چھٹکارا مل گیا ہے۔ اس پرآشوب دور میں جب لوگ بھوکوں مر رہے ہیں، ڈھائی سو روپے کی رقم معمولی نہیں۔ غربت اور مالی پریشانی میں اس رقم کی ادائیگی کا سن کر کانوں پہ ہاتھ رکھنے کو دل چاہتا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے، دولت جان کا صدقہ اور آبرو کی ڈھال ہوتی ہے۔ روپے گئے تو گئے کم از کم آبرو تو بچ گئی، یہی کافی ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ جس نے بے آبروئی سے بچایا اور یہ سبیل پیدا کی۔

میاں یہاں تو کھانے کو روٹی میسر نہیں، اوڑھنے بچھونے کے سامان لحاف وغیرہ کا انتظام نہیں۔ یعنی اس قدر رقم نہیں کہ زندگی کے بنیادی تقاضے پورے کئے جا سکیں۔ تو کتابوں کی اشاعت کے لئے رقم کہاں سے آئے گی۔ غرض یہ کہ ان سطور میں غالب جیسے عظیم اور بے نظیر شاعر و دانشور کی معاشی بدحالی اور غربت کا اظہار ہوتا ہے جو اپنی زندگی پرسکون نہیں گزار سکتا اور خود اپنی تخلیقات کی اشاعت کا بندوبست نہیں کر سکتا یہ سطور ہمیں شعراء اور اہلِ دانش کی معاشی پریشانی کے سبب ذہنی اذیت کی نشاندہی کرتی ہے۔

اقتباس ۲: **اہلِ خط کا حال از روئے تفصیل مجھ کو کیوں معلوم ہو؟ سنتا ہوں کہ دعویٰ خون پیش کیا چاہتے ہیں۔ سودہ ہو گیا۔ مسودہ ہو رہا ہے۔ ایک صاحب کے جے پور میں ٹکڑے اڑ گئے۔ گو رنر مدعی نہ ہوئے قصاص نہ لیا۔ اب ہندوستانی کے خون کا قصاص کون لے گا؟ خیر جو ہونا ہے ہو رہے گا۔ بعدِ وقوع ہم بھی سن لیں گے۔ تم اتنا کیوں دل جلا رہے ہو۔**

ربطِ ماقبل:

غالب نے اپنے شاگرد میر مہدی مجروح کے خط کے جواب میں انھیں خط لکھا اور ان کا خط ملنے پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے خط کو بالمشافہ ملاقات کے مترادف

قرار دیا اور غدر دہلی کے بعد اہلِ دہلی پر نازل ہونے والی مصیبتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ میر مہدی مجروح کے بھائی میر سرفراز حسین کو نوکری کے حصول کے لئے الور جانے کی تلقین کی ہے۔ اس کے بعد اپنی پنشن کی بحالی کے سلسلے میں سرکاری پیش رفت کی وضاحت کرتے ہیں اور سرکار کی جانب سے اپنے بے قصور کئے جانے کا ذکر کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی تخلیقات کے ذاتی طور پر اشاعت کا اہتمام نہ کر سکنے کی وجوہ یعنی معاشی بدحالی کا ذکر اور ان کی اشاعت کے سلسلے میں مختلف مراحل اور معاونین وذمہ داران کا مفصل ذکر کیا گیا ہے۔

تشریح:

پیشِ نظر سطور میں غالب نے میر مہدی کو ان کے استفسار پر جنگِ آزادی کے بعد ہندوستان پر اس کے اثرات سے آگاہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کو معاشی، سماجی، سیاسی اور تہذیبی طور پر تباہ کن اثرات اور حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اور گلی گلی کوچے کوچے کیسی قتل وغارت گری مچی۔

غالب کہتے ہیں کہ جو قتل وغارت گری مچی اس کی تفصیل تو مجھے معلوم نہیں البتہ اتنا معلوم ہے کہ جو لوگ مارے گئے ان کے ورثہ سرکار سے بدل کے مطالبے کی تیاری کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا مطالبہ حکومت نے مان لیا ہے اور خون بدل کے طور پر رقم دینے پر راضی ہوگئی ہے۔ معاہدے کی دستاویزات بھی تیار ہوگئی ہے۔

ایک اطلاع کے مطابق جے پور میں ہندوستانیوں نے ایک انگریز کو بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔ اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے ہیں۔ جے پور کے گورنر نے اس قتل پر شدید ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نہ ہی اس نے انگریز کے خونِ بدل کے طور پر قاتلوں سے کوئی معاوضہ طلب کیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب انگریز کے قتل ہونے کی صورت ہے جو متوقع نہیں تھی، تو پھر کبھی مسلمان یا ہندو کے قتل ہونے پر انگریز حکومت سے قصاص یا خون کے بدل کا دعویٰ کرنے کی کون ہمت کر سکتا ہے۔

ان سطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگِ آزادی کے بعد کس قدر نفسا نفسی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا۔ ہندوستانی وانگریز دونوں کی جانیں غیر محفوظ تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ غالب کا یہ خط ان حالات کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ خط ہی تاریخی دستاویز ہے۔

خطوطِ غالب (۲)

نامہ نگار: مرزا اسداللہ خاں غالب　　مکتوب الیہ: یوسف مرزا

تعارف نامہ نگار:

مرزا غالب عظیم شاعر، مخصوص، منفرد اور جدید خطوط نگاری کے موجد تھے۔ خطوط میں بے تکلفی، سادگی، اختصار وجامعیت، جزئیات نگاری، نکتہ نگاری، نکتہ آفرینی اور مزاح وظرافت کو اپنانے، مختلف اسالیب بیان مہارت سے کھپانے، انھیں اپنی سوانح حیات اور اپنے زمانے کی تاریخ بتانے والے، وہ منفرد دانش ور ہیں۔ جن کے خطوط، اردو نثر میں نیا تجربہ اور نقشِ اول ثابت ہوئے۔ انھوں نے اپنے اس موقف کو سچ کر دکھایا کہ، ان کی خطوط نگاری شاعری کی طرح ان کے دعویٰ کی سچائی پیش کرتی ہے کہ

اوائے خاص سے غالب ہوا نکتہ سرا
صدائے عام ہیں یارانِ نکتہ داں کے لیئے

تعارفِ مکتوبِ الیہ:

یوسف مرزا امیر محمد نصیر کے فرزند تھے جو لکھنو میں رہتے تھے۔ ان کی والدہ قدسیہ سلطان، مرزا غالب کے دوست حسین مرزا کی بہن تھیں۔ انھوں نے زندگی کا زیادہ تر حصہ دہلی میں گزارا۔ غالب حسین مرزا کے بیٹوں سجاد مرزا اور اکبر مرزا اور بھانجے یوسف مرزا کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ یہ خط انھی کے نام ہے۔

اقتباس ۱: یوسف مرزا! کیوں کر تجھ کو لکھوں کے باپ مرگیا۔ اور اگر تجھ کو لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر؟ یہ ایک شیوہ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔

تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔
صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سرو پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔

تشریح:

پیشِ نظر سطور مرزا غالب کے خط یوسف مرزا کی ابتدائی سطور ہیں جن میں غالب نے مرزا یوسف سے ان کے باپ کے انتقال پر اظہارِ افسوس یا تعزیت کی ہے۔ ان کے یہ تعزیتی الفاظ ان کے مؤثر اندازِ بیان اور واقعات نگاری کا ثبوت ہے۔ مرزا یوسف کے باپ جو انگریز دشمنی کے الزام میں قید تھے زنداں میں بیمار ہو گئے انگریز نے ان کی رہائی کا حکم دیا لیکن اس سے قبل ہی وہ دنیا سے رحلت فرما گئے۔ جب غالب کو ان کی وفات کا بذریعہ خط علم ہوا تو جواباً مرزا سے یوں تعزیت کر رہے ہیں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں تمھارے باپ کی موت کا اپنی زبان سے ذکر کروں۔ سمجھ میں نہیں آتا کو کس طرح اظہارِ افسوس کروں اور تمھیں تسلی دوں۔ زمانے یا دنیا کا یہ دستور ہے کہ لوگ لواحقین کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ سوچو! بھلا یہ کیسا دستور و طریقہ ہے کہ کسی شخص کا عزیز اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے وہ اس کی جدائی پر رنجیدہ اور ملول ہو اور لوگ کہیں اس نقصان پر صبر کرو، غم و آہ و زاری نہ کرو۔ حالانکہ عزیز کی جدائی پر مضطرب اور بے چین ہونا، فطری عمل ہے اور اسے کہا جائے میاں صبر کرو بھلا کیسے ممکن ہے کہ اسے صبر آجائے میرے نزدیک تو ایسے ماحول میں صبر کی تلقین کرنا تسلی دینا فضول معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ چند الفاظ اس کی بے چینی اور تڑپ کو کم نہیں کر سکتے۔ سچ ہے اس دکھ اور غم کا ازالہ نہ تو دعا سے ہو سکتا ہے نہ دوا سے یعنی عزیز کی موت یا فرقت کا داغ آسانی سے نہیں مٹ سکتا جیسا کہ عموماً تصور کیا جاتا ہے۔ مرزا یوسف تمھارا دل یقیناً بہت زخمی اور گھائل ہے۔ تمھیں پہلے ہی بیٹے کی جدائی کا گھاؤ لگا ہوا ہے۔ اب باپ کی جدائی کا بھی غم لاحق ہو گیا ہے۔ سچ ہے جس کے سینے پر ایسے گہرے گھاؤ ہوں جس کا جگر داغدار ہو اس سے کہا جائے گریہ و زاری نہ کرو آنسو نہ بہاؤ آہ و بکا نہ کرو کسی طرح مناسب نہیں۔ آخر باپ کی موت پر اظہارِ غم سے روکنے کا کیا فائدہ ہے۔ کیوں نہ اسے آزاد چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ رو رو کر دل کی بھڑاس نکال لے۔ غالب نے آخری جملے میں اپنی بلاغت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ بے سرو پا کس کو کہتے ہیں یعنی بے سہارا کسے کہا جاتا ہے تو میرے نزدیک اس کی مثال یوسف مرزا ہیں۔ کیونکہ باپ کا سایہ ہمیشہ کے لئے سر سے اٹھ گیا اور مستقبل کا سہارا بیٹا بھی جدا ہو گیا۔ اب یوسف مرزا بے یار و مددگار رہ گیا ہے۔

اقتباس ۲: تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا، یہ بات سچ ہے اگر تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قیدِ حیات رہی، نہ قیدِ فرنگ۔
ہاں صاحب، وہ لکھتی ہیں، کہ پنشن کا روپیہ مل گیا ہے، وہ تجہیز و تکفین کے کام آیا۔ یہ کیا بات ہے؟ جو مجرم ہو کر چودہ برس کو مقید رہا ہو، اس کا پنشن کیوں کر ملے گا اور کسی کی درخواست سے ملے گا؟ رسید کس سے لی جائے گی؟

ربطِ ماقبل:

اس سطور سے قبل غالب، یوسف مرزا کے نام ان کے باپ میر نصیر کی وفات پر تعزیت کرتے ہوئے اپنے مخصوص طرزِ بیان میں دستورِ زمانہ کے مطابق تعزیت کرنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس شخص کا عزیز اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے، جس کا دل ہم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے زمانے کے دستور کے مطابق اسے صبر کی تلقین کرنا اور آہ و زاری نہ کرنے کا کہنا عجیب لگتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔

تشریح:

پیشِ نظر سطور میں غالب مرزا یوسف کو لکھتے ہیں کہ تمھاری دادی کے خط سے معلوم ہوا کہ انتقال سے قبل تمھارے باپ کو انگریزوں کی قید سے چھٹکارے کا حکم ہو گیا تھا۔ اگر یہ بات درست بھی ہے تو کیا فائدہ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس جواں ہمت، نڈر اور بہادر شخص کو بیک وقت زندگی کے مصائب، تکالیف اور پریشانیوں سے بھی نجات مل گئی اور انگریزوں کی قید سے بھی۔ سانحہ تو یقیناً عظیم ہے لیکن جو کچھ ہوا ان کے حق میں اچھا ہوا۔ تمام الجھنوں سے آزادی مل گئی۔ دنیا ایک قید خانہ ہے جہاں انسان کی خواہشات کا خون ہوتا ہے اور وہ اپنی مرضی کے بجائے جبر کی زندگی گزارتا ہے۔

بقول میرؔ

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا دن کو جوں توں شام کیا

تمہاری دادی کے خط سے بھی معلوم ہوا کہ انگریزوں نے جو پینشن دی وہ ان کی تکفین و تدفین میں خرچ ہوگئی۔ بھلا، بتائیے اس کے مرنے کے بعد اس کی کیا ضرورت تھی۔ جس شخص کو حق کی حمایت اور انگریز کی مخالفت کی پاداش میں چودہ سال کی قید ہوئی اور پھر وہ دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اس کو پینشن ملنا نہ ملنا فضول ہے۔ اب اس کی وصولیابی کی رسید پر کون دستخط کرے گا۔ آہ وہ پینشن کا مستحق تو دکھ جھیلتے جھیلتے اور حاکم کے ظلم سہتے سہتے اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اب اسے پینشن کا مستحق سمجھنا اور ورثا کو نوازنا عجب بات ہے۔

اقتباس ۳: **مصطفیٰ خان کی رہائی کا حکم ہوا۔ مگر پینشن ضبط۔ ہر چند اس پرسش سے کچھ حاصل نہیں۔ لیکن بہت عجیب بات ہے تمہارے خیال میں جو کچھ آئے گا وہ مجھ کو لکھو۔ دوسرا امر یعنی تبدیل مذہب عیاذاً باللہ اعلیٰ کا غلام کبھی مرتد نہ ہوگا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ حضرت چالاک اور سخن ساز ظریف تھے۔ سوچے ہوں گے میں اپنا کام نکالوں اور رہا ہو جاؤ۔ عقیدہ کب بدلتا ہے اگر یہ بھی تھا تو ان کا گمان غلط تھا۔ اسطرح رہائی ممکن نہیں۔**

ربطِ ماقبل:

اس سطور سے قبل غالب، یوسف مرزا کے نام ان کے باپ میر نصیر کی وفات پر تعزیت کرتے ہوئے اپنے مخصوص طرز بیان میں دستورِ زمانہ کے مطابق تعزیت کرنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس شخص کا عزیز اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے، جس کا دل ہم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے زمانے کے دستور کے مطابق اسے صبر کی تلقین کرنا اور آہ و زاری نہ کرنے کا کہنا عجیب لگتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔

غالب کہتے ہیں کہ تمہارے باپ کا انتقال یقیناً دکھ کی بات ہے لیکن ایک طرح سے اچھا ہے کہ انہیں دنیا اور انگریز دونوں کی طرف سے رہائی مل گئی۔ ساتھ ہی ان کی پینشن ان کی موت کے بعد ملنے پر افسوس کیا ہے۔

تشریح:

نواب مصطفیٰ علی خان شیفتہ کی انگریزوں کی قید سے رہائی کے سلسلے میں یہ بات عام طور سنی جارہی تھی کہ وہ آزادی کی خاطر اسلام کو خیرباد کہتے یعنی مذہب قبول کرنے کو تیار تھے۔ ان کا مقصد تھا کہ انگریز خوش ہو جائیں اور انھیں آزاد کردے۔ غالب کہتے ہیں کہ یہ خبر درست معلوم نہیں ہوتی۔ اللہ سے توبہ اور پناہ مانگتا ہوں بھلا جو شخص دل و جان سے حضرت علیؓ کا پیرو اور ماننے والا ہو وہ بھلا اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کرسکتا ہے۔ ہر گز ہر گز نہیں۔ البتہ مصطفیٰ خان بڑے سمجھدار، باتونی اور ظریفانہ مزاج کے حامل تھے۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ اس وقت انگریز کو دھوکا دے کر چھٹکارا حاصل کرلیا جائے۔ مذاق کا مذاق رہے گا اور انگریز دام میں آگیا تو آزادی بھی مل جائیگی۔

غالب کہتے ہیں کہ جب مذہبی عقائد انسان کے دل میں راسخ اور پختہ ہو جاتے ہیں تو وہ انھیں ترک نہیں کرسکتا اور اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ مصطفیٰ خان اپنے طور پر سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ مذہب اسلام کو ترک کرچکے ہیں تو یہ اُن کی خام خیالی ہے اس طرح نہ انگریز کو یقین آسکتا ہے کہ وہ سچ بول رہے ہیں اور نہ خود اُن کا اپنا ضمیر اس معاملے اُن کا ساتھی بن سکتا تھا۔

خطوطِ علاّمہ اقبالؒ

حوالہ:

مندرجہ بالا عبارت "علامہ محمد اقبالؒ" کے خط سے لی گئی ہے جو انھوں نے اپنے رفیق دوست "مولوی انشاء اللہ خان" کے نام تحریر کیا۔

تعارف خطوط نگار:

علامہ محمد اقبالؒ وہ صاحب پیغام مفکر ہیں جنہوں نے آفاقی شاعری کی بنیاد رکھی اور سازِ سخن کو وسیلہ بنا کر اسلامی انقلاب کے لیئے راہ ہموار کی۔ ایک انقلاب آفرین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ آپ خطوط نگار کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ خطوطِ اقبال میں جولب ولہجہ پایا جاتا ہے اس میں ایک حکیمانہ وقار، داعیانہ جوش وجلال اور دردمندانہ تڑپ ہے۔

تعارف خط:

یہ خط اقبال نے اس وقت تحریر کیا جب وہ بحری جہاز پر بمبئی سے انگلستان کا سفر طے کر رہے تھے۔ خطوط نگار کا مقصد انگلستان میں اعلیٰ تعلیم کا حصول تھا جس کا ذکر انہوں نے اپنے خط میں بھی کیا ہے۔ اس خط میں اقبال نے دہلی اور بمبئی کے واقعات ومناظر کے علاوہ عرب سرزمین کے دیدار پر اپنے تاثرات بھی بیان کیئے ہیں۔ اس خط سے ان میں پائے جانے والے عشق کا اظہار ہوتا ہے اور ان کی شخصیت کا جوش جھلکتا ہے۔

اقتباس ۱: آپ سے رخصت ہو کر اسلامی شان وشوکت کے اس قبرستان میں پہنچا جس کو دہلی کہتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر خواجہ سید حسن نظامی اور شیخ نذر محمد صاحب اسسٹنٹ مدرس موجود تھے۔ تھوڑی دیر کے لیئے شیخ موصوف کے مکان پر قیام کیا' بعد ازاں حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر حاضر ہوا اور تمام دن وہاں بسر کیا۔

اللہ اللہ! حضرت محبوب الٰہی کا مزار بھی عجیب جگہ ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیئے کہ دہلی کی پرانی سوسائٹی حضرت کے قدموں میں مدفون ہے۔ خواجہ حسن نظامی کیسے خوش قسمت ہیں کہ ایسی خاموش اور عبرت انگیز جگہ میں قیام رکھتے ہیں۔ شام کے قریب ہم اس قبرستان سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ ذرا غالب مرحوم کے مزار کی بھی زیارت ہو جائے خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران سے گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنجِ معانی مدفون ہے۔ جس پر دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی۔

تشریح:

شاعرِ مشرق مولوی انشاء اللہ خان سے مخاطب ہیں آپ سے ملاقات کے بعد میں اسلامی عظمت وقوت کے اس قبرستان میں پہنچ گیا ہوں جس کو "دلی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ دلی کے ریلوے اسٹیشن پر خواجہ حسن نظامی اور شیخ نذر صاحب (جو نائب ناظم تعلیمات ہیں) موجود تھے تھوڑی دیر کے لیئے شیخ صاحب کے مکان پر قیام کیا' اس کے بعد حضرت محبوب الٰہی خام الدین اولیاء کے مزار پر حاضری دی اور پورا دن وہیں قیام کیا۔ محبوب الٰہی کا مزار بھی کیا خوب جگہ ہے۔ اس کو ایسے سمجھ لیجیئے کہ دلی کا پرانا معاشرہ یہاں دفن ہے خواجہ حسن نظامی خوش قسمت انسان ہیں۔ جو یہاں رہتے ہیں۔ دلی جو خاموش اور عبرت انگیز مقام کی حیثیت رکھتی ہے۔ شام کے وقت ہم اس مزار سے چلنے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ ذرا مرزا غالب کے مزار کی بھی زیارت کر لیں۔ خواجہ صاحب ہم کو اس جگہ لے گئے جہاں علم کا خزانہ دفن تھا۔ غالب پر دلی والے ہمیشہ فخر کرتے رہیں گے۔

اقتباس ۲: اگرچہ دہلی کے کھنڈر مسافر کے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں۔ مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہر مقام کی سیر سے عبرت اندوز ہوتا۔ شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے پر فاتحہ پڑھی۔ دارا شکوہ کے مزار کی خاموشی میں دل کے کانوں سے ھو الموجود کی آواز سنی اور دہلی کی عبرت ناک سرزمین سے ایک ایسا اخلاقی اثر لے کر رخصت ہوا جو صفحۂ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔

تین ستمبر کی صبح کو میر نیرنگ اور شیخ محمد اکرام اور باقی دوستوں سے دہلی میں رخصت ہو کر بمبئی کو روانہ ہوا اور چار کو خدا خدا کر کے اپنے سفر کی پہلی منزل پر جا پہنچا۔

تشریح:

دہلی میں تاریخی عمارتیں بہت ہیں' جواب تباہ و برباد ہو چکی ہیں' ان کو دیکھنے کو بہت دل چاہا مگر میرے پاس وقت کم تھا کہ دہلی کی ہر جگہ کو دیکھ کر عبرت حاصل کرتا۔ شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے پر فاتحہ پڑھی۔ داراشکوہ کے مزار کی خاموشی دیکھ کر اسی کے موجود ہونے کی آواز سنی اور دلی کی عبرت ناک سرزمین نے دل پر ایسے اثرات مرتب کیئے جو کبھی بھی ختم نہیں ہوں گے۔ تین ستمبر کو نیرنگ اور شیخ محمد اکرام اور باقی دوستوں سے رخصت ہوا' بمبئی کو روانہ ہوا اور چار ستمبر کو اپنے سفر کی پہلی منزل پر پہنچ گیا۔

اقتباس ۳: بمبئی (خدا اسے آباد رکھے) عجب شہر ہے! بازار کشادہ' ہر طرف پختہ سر بہ فلک عمارتیں ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ ان سے خیرہ ہوتی ہے۔ بازاروں میں گاڑیوں کی آمدورفت اسقدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہاں ہر چیز مل سکتی ہے۔ یورپ۔ امریکہ کے کارخانوں میں کوئی چیز طلب کرو فوراً ملے گی۔ ہاں البتہ ایک چیز ایسی ہے جو اس شہر میں نہیں مل سکتی یعنی فراغت۔ میں بمبئی یعنی باب لندن کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوں خدا جانے لندن کیا ہوگا جس کا دروازہ ایسا عظیم الشان ہے اچھا دیدہ خواہ شد۔ سات ستمبر کو ہم دو بجے وکٹوریہ ڈاک' (گھاٹ) پر پہنچے جہاں مختلف کمپنیوں کے جہاز کھڑے ہیں اللہ اکبر! یہاں کی دنیا ہی نرالی ہے کئی طرح کے جہاز اور سیکڑوں کشتیاں ڈاک میں کھڑی ہیں اور مسافر سے کہہ رہی ہیں کہ سمندر کی وسعت سے نہ ڈر۔ خدا نے چاہا تو ہم تجھے صحیح سلامت منزل مقصود پر پہنچا دیں گے۔ خیر طبی معائنے کے بعد میں اپنے جہاز پر سوار ہوا!

تشریح:

بمبئی بھی بڑا عجیب شہر ہے' اللہ اسے ہمیشہ آباد رکھے' بڑے بڑے بازار ہیں' ہر جانب پکی عمارتیں جو آسمانوں کو چھوتی ہوئی معلوم دیتی ہیں کو دیکھنے والوں کی نگاہیں ٹھہرتی نہیں ہیں۔ بازاروں میں رش بہت ہے' گاڑیاں بھی بہت زیادہ ہیں کہ پیدل چلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ یہاں دنیا کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ امریکہ کی بنائی ہوئی چیزیں فوراً مل جاتی ہیں' البتہ اس شہر میں ایک چیز کی بہت کمی ہے یعنی فرصت کسی کو بھی نہیں ہے۔ بمبئی کو لندن جانے کا دروازہ بھی کہا جاتا ہے۔ خدا جانے لندن شہر کیسا ہوگا۔ سات ستمبر کو بمبئی کی بندرگاہ وکٹوریہ پہنچے' جہاں مختلف کمپنیوں کے بحری جہاز کھڑے تھے جنہیں دیکھ کر علامہ اقبال نے حیرانی سے اللہ اکبر نعرہ لگایا۔ بمبئی کی بندرگاہ کی بھی دنیا عجیب ہے کئی طرح کے جہاز اور کشتیاں کھڑی ہیں اور مسافروں سے یوں کہہ رہی ہیں کہ سمندر کی وسعت سے نہ ڈرو' اللہ نے چاہا تو ہم تمہیں خیر و عافیت سے منزل مقصود تک پہنچا دیں گے۔ اس کے بعد میرا ڈاکٹروں نے معائنہ کیا اور جہاز میں سوار ہو گیا۔

اقتباس ۴: اے عرب کی مقدس سرزمین تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی جسے دنیا کے معماروں نے رد کر دیا مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا فسوں کیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی! تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازت آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو! کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروانہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذان بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجی تھی۔

تشریح:

علامہ اقبال عرب کی زمین کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے عرب کی پاک زمین جس پر میں آج کھڑا ہوں' اس پاک اور مقدس سرزمین کو پہلے آنے والے رہنماؤں نے ٹھکرا دیا تھا لیکن ایک یتیم بچے (حضرت محمد ﷺ) نے اللہ جانے کیا جادو کر دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب' ثقافت کی بنیاد یہی عرب کی سرزمین بن گئی۔ عرب کے صحراؤں نے ہزاروں پاک' مقدس نقش قدم دیکھے' اور ان کھجور کے درختوں کے سائے میں ہزاروں اولیاء اور بادشاہوں نے سورج کی تپتی ہوئی گرمی سے پناہ حاصل کی۔ علامہ دعا کرتے ہیں کہ کاش گناہوں سے بھرے ہوئے میرے جسم کی خاک بھی اس عرب کی زمین کی خاک میں مل کر صحراؤں میں اڑتی پھرے تو یہ آوارگی

میرے سیاہ دنوں کا کفارہ بن جائے۔ دعا کرتے ہیں کہ میں عرب کے صحرا میں لٹ جاؤں اور دنیاوی سامان سے نجات پا کر تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے زخموں کی پروانہ کرتا ہوا اس پاک شہر مکہ، مدینہ پہنچوں جہاں حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی محبت سے بھرپور اذان کی آواز گونجی تھی۔

اقتباس ۵: جہاز کے سفر میں دل پر اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارا ہے۔ باری تعالیٰ کی قوت ناتمام کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے شائد ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو۔

حج بیت اللہ میں جو تمدنی اور روحانی فوائد ہیں، ان سے قطع نظر کر کے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفنات وسعت کا دیکھنا ہے جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ محض ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔

تشریح:

پیش نظر عبارات خطوط نگار نے اس وقت رقم کی ہیں جب وہ حج بیت اللہ کی ادائیگی کے لئے مقدس سرزمین عرب کی جانب گامزن تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ دورانِ سفر وسیع و عریض سمندر کا ہیبت ناک نظارہ ذہن کو ہلا دیتا ہے اور اس کی بے باک موجیں دل پر ایک گہرا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ بلند ہوتی لہریں اس قدر طاقتور ہوتی ہیں کہ بحری جہاز معمولی کشتی کی طرح ڈولنے لگتا ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا ہے جس پر ایک تنہا لوگوں کا گروہ جانب منزل ہوتا ہے۔ یہی تنہائی انسانی عقل و فہم کو غور و فکر کی بھرپور دعوت دیتی ہے اور اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ ایک ایسی ہستی کا اقرار کرلے جو مطلق کل ہو اور جس کی رضا و مشیت سے تمام اعمال مشروط ہوں۔ اتنے بڑے سمندر کو اپنے چاروں طرف دیکھ کر مغرور انسان کو بھی اپنے تکبر کا گلا گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے دل میں ایک غیر یقینی کیفیت جنم لیتی ہے جو اسے بار بار یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ وہ زندہ بچ بھی سکے گا یا نہیں۔ اس کا دل خود ہی اس نگہبانِ حقیقی کی طرف کھنچ جاتا ہے جو اس کا بھی خالق ہے اور اس وسیع و عریض میں موجود ہر شے کا بھی۔ خطوط نگار نے اپنے مشاہدے کی روشنی میں یہ نظریہ بجا طور پر پیش کیا ہے کہ حج کرنے سے انسان کو یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ دورانِ سفر خشیت الٰہی کے چراغ روشن ہو جاتے ہیں اور انسان غرور و تکبر کی کیفیات سے نکل جاتا ہے۔ اس طرح حج کی تکمیل اس کے اصل معنوں میں ہوتی ہے۔